جون 2008

قیمت : -/10 روپے

اردو دنیا

[illegible]

قومی سیمینار "جنگ آزادی میں بہار و بنگال کا حصہ اور اردو زبان و ادب" کے دوسرے دن اسٹیج پر مولوی محمد بشارت حسین، جناب ابوذر ہاشمی، پروفیسر سلیمان خورشید، ڈاکٹر ابوبکر عباد اور مائک پر ڈاکٹر رضا حیدر۔

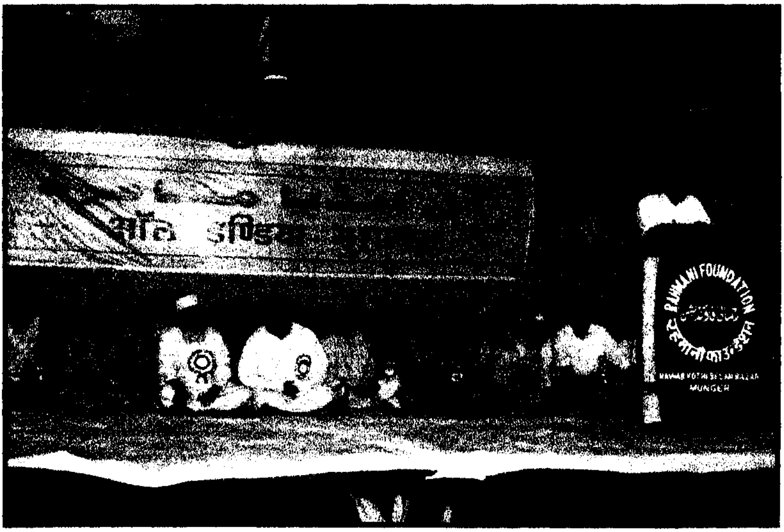

قومی سیمینار کے دوسرے دن منعقدہ مشاعرے کا ایک منظر — پہلی صف میں جناب مخمور سعیدی، ڈاکٹر علی جاوید، پروفیسر لطف الرحمن اور مولانا محمد ولی رحمانی دیکھے جاسکتے ہیں۔

ماہنامہ

اردو دنیا نئی دہلی

جلد-10، شمارہ-6، جون 2008

مدیر: ڈاکٹر علی جاوید

اعزازی مدیر: مخمور سعیدی

ناشر اور طابع:
ڈائرکٹر قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان
وزارت ترقی انسانی وسائل، محکمۂ اعلیٰ تعلیم، حکومت ہند

کمپوزنگ: شہناز اختر

مطبع: ایس نارائن اینڈ سنز، بی-88، اوکھلا انڈسٹریل ایریا،
فیز-II، نئی دہلی-110020

مقام اشاعت: دفتر قومی اردو کونسل

قیمت -/10 روپئے، سالانہ -/100 روپئے

ڈرافٹ NCPUL, New Delhi کے نام ارسال کریں۔

صدر دفتر:
ویسٹ بلاک-1، ونگ-6
آر. کے. پورم نئی دہلی- 066 110
فون: 26103938, 26103381
فیکس: 26179657, 26108159
ویب سائٹ:
http://www.urducouncil.nic.in
email: urduduniyancpul@yahoo.co.in
urducouncil@gmail.com

شعبۂ فروخت:
ویسٹ بلاک-8، ونگ-7،
آر. کے. پورم نئی دہلی-110066
فون: 26169416, 26109746

شاخ: 22-7-110 تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس،
بلاک نمبر 5-1، پتھر گٹی، حیدرآباد-500002
فون: 24415194 - 040

اس شمارے میں

آپ کی بات .... قارئین کے خطوط 2
ہماری بات .... ادارہ 5

زبان اور تعلیم
- اچھی اردو: روزمرہ، محاورہ، صرف .... شمس الرحمن فاروقی 6
- اردو رسم الخط .... محمد ہاشم قدوائی 8
- اردو میڈیم اسکولوں کے مسائل .... محمد اختر صدیقی 9
- تعلیم کا گرتا معیار اور اس کے اسباب .... مناظر عاشق ہرگانوی 12
- تعلیم اور اخلاقی قدریں .... محمد علی جوہر 14

ادب
- بڈ انہیں مری (افسانہ) .... ذکیہ مشہدی 16
- اردو میں بچوں کا ادب .... ایم مبین 21

شخصیات
- حبیب تنویر ایک شخص — ایک شخصیت .... اشفاق محمد خاں 23
- گیان پیٹھ انعام پانے والی اردو شخصیات .... عبداللہ امتیاز احمد 26

سائنس اور ٹیکنالوجی
- عظیم ہندوستانی سائنس داں .... محمد عبداللطیف 28
- اردو ناول، انٹرنیٹ اور متوقع قاری .... ارشاد عالم 31

کیریئر
- کمپیوٹر نیٹ ورکنگ شعبے میں روزگار کے مواقع .... محمد احتشام الحسن مجاہد 35

روبرو
- عصمت چغتائی سے بات چیت .... کنھیا لال نندن/علی جاوید 37

ہماری مطبوعات سے
- ترکی حملوں کے وقت ہندوستان کی حالت .... محمد حبیب/خلیق احمد نظامی 41
- دیباچہ — نغمات حریت .... شمس الرحمن فاروقی 47

اردو خبرنامہ .... ادارہ 51

تبصرہ و تعارف
- جامع التذکرہ .... عمیر منظر 69
- مرزا محمد رفیع سودا .... مشکور معینی
- جتنے پاس اتنے دور .... احمد کفیل
- جدید عربی ڈرامہ .... ابوبکر عباد
- غلام گردش .... فیروز عالم
- قرآن منظوم مع فرہنگ و تفسیر .... فخرالدین وحید

بچوں کا گوشہ
- ہوشیار چور .... زبیر احمد بھاگلپوری 76
- مجھے معاف کردو .... جلیل عشرت 79

آپ کی بات

■ **ڈاکٹر پردیپ جین، B-48، نئی منڈی، مظفر نگر-251001**

"اردو دنیا" کے اپریل 2008 کے شمارے میں راقم کے تعارفی نوٹ کے ساتھ پریم چند کا ایک افسانہ "آسمان کی پری" شائع ہوا ہے جس کی نسبت میرا خیال تھا کہ یہ افسانہ نایاب ہے۔ لیکن ڈاکٹر ابرار رحمانی نے فون پر اطلاع دی کہ یہ افسانہ 15 برس قبل ڈاکٹر علی احمد فاطمی کے تعارفی نوٹ کے ساتھ "آجکل" میں شائع ہو چکا ہے۔ میں نے ڈاکٹر ابرار رحمانی سے ملاقات کی تو انھوں نے مجھے "آجکل" کے نومبر 1993 کے شمارے کے صفحہ نمبر 35 تا 39 کے ان اوراق کی فوٹو کاپی بھی مہیا کرادی جن میں یہ افسانہ شائع ہوا تھا۔

مجھے سخت افسوس ہے کہ "آجکل" کے مذکورہ شمارے تک میری رسائی نہ ہو سکی تھی اور میں اس حقیقت سے بے خبر تھا۔ دراصل ڈاکٹر علی احمد فاطمی کا جو خط "آجکل" کے دسمبر 2006 کے شمارے میں شائع ہوا تھا اور جس کی نقل میں نے اپنے تعارفی نوٹ میں بھی پیش کی ہے، اس میں اس امر کا کوئی اشارہ موجود نہیں ہے۔ اس خط سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ یہ افسانہ گمنامی کے اندھیروں میں ہے۔ نیز جب میں نے ڈاکٹر فاطمی سے فون پر بات کی تب بھی دوران گفتگو انھوں نے "آجکل" کا کوئی ذکر نہیں کیا اور مجھے اس کی جو فوٹو کاپی ارسال کی وہ بھی "آجکل" سے نہ ہو کر آگرہ کی پردہ نشیں زنانہ لائبریری کے زیر اہتمام شائع شدہ کتابچے کی ہی تھی۔ ان حالات میں میرا گمراہ ہو جانا قرین قیاس تھا چنانچہ میں اس دست یاب افسانے کو نایاب بتانے کی جسارت کر بیٹھا۔

یہاں میں یہ واضح کردوں کہ پریم چند کا یہ افسانہ نہ تو "کلیات پریم چند" میں آسکا جو قومی اردو کونسل نے شائع کی ہے اور نہ ہی ہندی میں شائع ہونے والی "پریم چند رچناولی" میں شامل ہے۔ لہٰذا ایک اعتبار سے اس افسانے کو نایاب بھی کہا جا سکتا ہے۔ تاہم اپنی بے خبری کے لیے میں سخت نادم ہوں اور معافی کا خواستگار۔

منشی پریم چند پر باقاعدگی کے ساتھ تحقیق کرنے والوں میں گوپال کرشن مانک ٹالا کا نام بھی شامل ہے انھوں نے اصل ماخذ تک پہنچنے کی کامیاب کوشش کر کے پریم چند ادبیات میں چند ایسے نتائج اخذ کیے جنھیں حرف آخر کی حیثیت حاصل ہے۔ بڑھتی ہوئی عمر کے ساتھ بینائی کمزور ہو جانے کے سبب مانک ٹالا صاحب کو پڑھنے لکھنے میں دشواری پیش آنے لگی تھی۔ چنانچہ انھوں نے اپنا تمام ادبی ذخیرہ جو پچھلے چالیس برس میں جمع کیا تھا میرے حوالے کر دیا ہے۔ جس میں ایک سو پندرہ ہندی، اردو اور انگریزی کی کتابیں شامل ہیں۔ ان کتابوں میں ڈراما "کربلا"، "پریم چالیسی حصہ اوّل" اور "روحانی شادی" کے پہلے ایڈیشن کے نسخے شامل ہیں۔ ان کے علاوہ متعدد رسائل کے مختلف شمارے اور ماہنامہ "زمانہ" کی 1917 کی مکمل فائل بھی شامل ہے۔ کتابوں اور رسائل کے علاوہ مانک ٹالا صاحب نے اپنے ذاتی نوٹس بھی میرے سپرد کر دیے ہیں۔ مانک ٹالا صاحب کے عنایت کردہ مواد میں پریم چند کی ایک نایاب کہانی "سودائے خام" کا متن بھی موجود ہے۔ میں موصوف کا تہہ دل سے شکر گزار ہوں کہ انھوں نے مجھے اس ذمے داری کو سنبھالنے کا اہل سمجھا اور اپنی تمام عمر کی کمائی مجھے سونپ دی۔

■ **محمد ہاشم قدوائی، C-501، راؤز ووڈ اپارٹمنٹ، میور وہار، نئی دہلی-91**

مئی 2008 کا "اردو دنیا" موصول ہوا۔ یہ شمارہ دوسرے شماروں سے کچھ بڑھ کر ہی رہا۔ عالی جناب شمس الرحمٰن فاروقی کا گراں قدر اور محققانہ مضمون "اچھی اردو" ڈاکٹر ابوبکر عباد کا مضمون "حسرت موہانی شاعری کی ریاست کا حزب مخالف" اور جناب عارف وقار کے مضمون "مذکر و مؤنث کی کج ادائیاں" سے خاص طور سے مستفید ہوا۔ جناب وقار کا مضمون بڑا ہی دلچسپ تھا۔ ان قابل قدر مضامین کی اشاعت پر دلی مبارکباد اور تہنیت قبول فرمائیں۔

■ **عبدالاحد ساز، محمد حاجی آدم اینڈ کمپنی، 84 چکلہ اسٹریٹ، ممبئی-3**

امید ہے مزاج عالی بخیر ہوگا۔ گزشتہ دنوں ممبئی یونیورسٹی کے سیمینار "ترقی پسند تحریک اور ممبئی" میں آپ کی آمد متوقع تھی۔ ہمیں خاصا اشتیاق و انتظار رہا۔ آپ بہ وجوہ تشریف نہ لا سکے۔

"اردو دنیا" برابر مجھے مل رہا ہے۔ اہم اور کارآمد معلوماتی مضامین اور معیاری ادبی مشمولات کے ساتھ۔ اپریل 2008 کے شمارے میں "شخصیات" کے تحت پنڈت برج موہن دتاتریہ کیفی پر گلزار دہلوی صاحب کا مضمون اور ممتاز جغرافیہ داں پروفیسر محمد شفیع پر محمد خلیل صاحب کا مضمون خاص طور پر پسند آئے۔ بچوں کے گوشے میں یونانی دیومالائی کہانی Pandoran Box سے ماخوذ شرجیل احمد خاں کا رائٹ اپ دلچسپ ہے۔

چندر بھان خیال کو ہم کافی عرصے سے پڑھتے آئے ہیں اور ان کی کچھ نظمیں ہمارے لیے بے حد قابل قدر ہیں۔ اردو کے موجودہ کوائف کے پیش نظر

چندر بھان خیال اور ان کے ہم زمرہ ادیبوں کی موجودگی نعمتِ غیر مترقبہ ہے۔

مشفقی ومکرمی مخمور سعیدی صاحب سے میرا آداب کہیے گا۔ کبھی آپ ممبئی تشریف لائیں تو ملاقات کا شرف ضرور عنایت کریں۔

■ حبیب الرحمٰن چغتائی، حریم، ملت روڈ، دودھپور، سول لائنز، علی گڑھ-2

عجیب اتفاق ہے کہ جب سے آپ نے "اردو دنیا" کی ادارت سنبھالی ہے ایک خط کے علاوہ میرا کوئی مضمون اس میں نہیں چھپا ہے جبکہ اس سے پہلے میرے مضامین اکثر شائع ہوتے رہے ہیں۔

ادھر "اردو دنیا" میں کچھ نمایاں تبدیلیاں آئی ہیں جو قابل ستائش ہیں اور امید کرتا ہوں کہ اسے خوب سے خوب تر بنانے میں آپ کی مساعی جمیلہ ضرور بارآور ثابت ہوں گی۔

■ ھریندر گری شاد، بھوتی ہاؤس، ویسٹ دگھی ٹینک، گیا-823001

"اردو دنیا" کا پرانا قاری ہوں مگر آپ کی خدمت میں خط بھیجنے کا یہ پہلا اتفاق ہے۔ ماہنامہ "اردو دنیا"، "واقعی پوری اردو دنیا کو سمیٹے ہوئے ہے۔ میں اردو ادب کا ایک ادنیٰ خادم ہوں۔ مجھے اردو زبان و ادب سے بے حد شغف ہے۔ محترم: کاش "اردو دنیا" میں کچھ تخلیقی ادب بھی شامل کیا جاتا تو کچھ اور ہی بات ہوتی۔

"اردو دنیا" کو تخلیقی ادب کی اشاعت سے کوئی پرہیز نہیں ہے اور اس میں اکثر تخلیقی ادب کی اشاعت ہوتی رہی ہے۔

■ مدثر ملک بحلیسی، طالب علم شعبۂ اردو، جموں یونیورسٹی، جموں

میں بڑی دلچسپی اور شوق سے "اردو دنیا" کا مطالعہ کرتا ہوں۔ یہ رسالہ نہ صرف اردو زبان و ادب کی ترویج و اشاعت میں منہمک ہے بلکہ عصری دنیا کی پوری عکاسی کر رہا ہے۔ شمس الرحمٰن فاروقی کا "اچھی اردو: روزمرّہ، محاورہ، صرف" ایک نہایت کارآمد صفحہ ہے۔

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان اپنے دوسرے کاموں کے علاوہ اس رسالے کے ذریعے بھی اردو کی بہترین خدمت انجام دے رہی ہے۔ کیوں کہ یہ رسالہ کم از کم ہندوستان میں اپنی نوعیت کا منفرد جریدہ ہے جو تعلیم، زبان، ادب اور ماحولیات وغیرہ سے متعلق نئے حالات سے ہم آہنگ کارآمد مواد فراہم کرتا ہے اور اس کے علاوہ اردو دنیا کی تازہ ترین خبروں سے بھی آگاہ کرتا ہے۔

■ سائرہ بانو، ٹی-398، گلی نمبر-23، گوتم پوری، دہلی-53

مئی کا ماہ نامہ "اردو دنیا" زیرِ مطالعہ ہے پہلے میں اس کے مشمولات پر نظر ڈالتی ہوں پھر گوشۂ ادب کے مضامین پڑھتی ہوں۔ بعد ازاں شخصیات، سائنس اور ٹیکنالوجی، کیریئر، ہماری مطبوعات سے، تبصرہ وتعارف اور بچوں کا گوشہ سے چیدہ چیدہ مضامین پڑھنے کے بعد "ہماری بات" کو صرف پڑھتی نہیں بلکہ غور کرتی ہوں کہ آیا ہندوستان و پاکستان سے نکلنے والے دیگر جرائد و رسائل ان اہم امور پر اس طرح اظہارِ خیال کیوں نہیں کرتے جس طرح "اردو دنیا" میں کیا جاتا ہے۔ گوشۂ زبان اور تعلیم میں شمس الرحمٰن فاروقی صاحب کی تحریر "اچھی اردو: روزمرہ، محاورہ، صرف" تو ایک مستقل کارآمد تحریر ہوتی ہے۔ اس کالم سے ہمعصر نسل کو جو روشنی مل رہی ہے اس کا اندازہ آپ کو شاید نہیں ہے۔ اردو کے ہمدردوں کو اس کالم کی غیر حاضری شاق گزرتی ہے (واضح ہو کہ اپریل کے شمارے میں یہ کالم شامل نہیں تھا)

"ہماری بات" میں اس بار بھی آپ نے ایک اہم موضوع ترجمے کی اہمیت و افادیت پر مختصراً مگر سیر حاصل گفتگو کی ہے جو دریا کو کوزے میں بند کر دینے کے مترادف ہے۔ آپ نے بڑے صاف لفظوں میں لکھا ہے کہ:

"مغربی زبانوں کے جو لفظ یا جو اصطلاحات اردو میں اپنی اصل یا کچھ بدلی ہوئی شکل میں رواج پا چکی ہیں اور بے تکلفی سے زبانوں پر رواں ہیں ان کے مترادفات تلاش کرنا اور ان مترادفات کو رواج دینے کی کوشش کرنا غیر ضروری ہی نہیں غیر مناسب بھی ہوگا۔"

یقیناً یہ اندازِ نظر ہی اردو کی توسیع وترقی کا ضامن ہے۔ آپ کے افکار تجربات کی سان پر صیقل شدہ ہوتے ہیں لہٰذا ہم طالب علموں کے لیے مشعلِ راہ ثابت ہوتے ہیں۔

عارف وقار کا مضمون "مذکر مؤنث کی کج ادائیاں" دلچسپ اور معلوماتی ہے۔ گوشۂ ادب میں باقر مہدی پر ندا فاضلی کا مضمون بہت دلچسپی سے پڑھا۔ وہ نسل جس سے باقر مہدی متعلق تھے اس کے افراد دھیرے دھیرے سفرِ آخرت اختیار کر رہے ہیں۔ اس پر ندا فاضلی جیسے اہم شاعر کا اس لیے تشویش میں مبتلا ہونا کہ اب ممبئی میں کسی لفظ کا تلفظ، کسی محاورے کا درست استعمال کسی انگریزی فارسی یا اردو کتاب کا نام یا اس کا درست حوالہ اب کون بتائے گا، ایک بڑے المیے کی نشاندہی ہے لیکن کیا نئی نسل اس المیے کی سنگینی سے واقف ہے؟ ڈاکٹر ابوبکر عباد کا مضمون "حسرت موہانی۔ شاعری کی ریاست کا حزبِ مخالف" محنت سے لکھا گیا مقالہ ہے۔ موصوف نے حسرت کی شاعری اور شعری لوازمات پر جس انداز میں گفتگو کی ہے وہ کتابی نہیں اکتسابِ متن سے حاصل شدہ نتائج ہیں اور دل کو لگتے ہیں خاص طور پر ان کا یہ خیال کہ

"حسرت کی محبوبہ گھر آنگن کی لڑکی ہے، پاس پڑوس کی دوشیزہ ہے، رشتے کی عم زاد ہے اور ہم جیسی انسان ہے۔ وہ ستم پیشہ جفا کار اور عیار نہیں۔ باحیا معصوم اور نوخیز ہے جو کبھی چھپ چھپا کر موقع نکال کر گھبرائی سہمی عاشق سے ملنے آجاتی ہے اور کبھی آنکھوں اشاروں میں محبوب سے باتیں کر لیتی ہے۔" کل ملا کر یہ شمارہ بھی گذشتہ شماروں کی طرح دستاویزی ہے۔ پروف کی

غلطی کا تعلق بھی اس رسالے سے دور دور کا ہے۔ ایک باوقار و باادب رسالہ نکالنے کے لیے میں آپ کو اور آپ کے تمام اراکین کو مبارکباد دیتی ہوں۔

■ قاضی محمد ایوب، شاہی ایک منارہ مسجد، جودھپور- 342001

مئی 2008 کے شمارے میں محترمہ ارجمند آرا کا تحریر کردہ مضمون بابا فرید گنج کا پیغام بہت پسند آیا۔ زبان کی شائستگی، گروارجن دیو کے حوالے سے ''گرو گرنتھ صاحب'' کی ترتیب میں بابا فرید کی پنجابی شاعری کی مقبولیت، اردو ترجمہ شدہ ''دوہے'' اور website میں بند مضمون کو صفحۂ قرطاس پر لاکر بابا فرید کے پیغام کو عوام تک پہنچایا۔ مبارک باد اور شکریہ۔

■ رام بدل شریواستو، سابق وائس پرنسپل، بلرام پور، یو. پی.

اپریل کا ''اردو دنیا'' بروقت ہدست ہوا۔ سرورق پر بہت دلکش سینری دیکھ کر دل باغ باغ ہوگیا۔ اس موسم بہار میں جب پوری کائنات دلہن کی شکل میں تبدیل ہوگئی ہے تو پھر اردو دنیا کیوں پیچھے رہ جائے بہت بہت مبارک باد۔ رسالے کے مدیر ڈاکٹر علی جاوید اور اعزازی مدیر مخمور سعیدی صاحبان کی نگرانی میں ''اردو دنیا'' کے وقار و معیار میں روز افزوں ترقی ہو رہی ہے۔

تازہ شمارے کے سبھی مشمولات قابلِ توجہ ہیں۔ خاص طور پر جناب محمد نثار کی ''پروفیسر بصیر احمد خاں سے گفتگو''، ''امتحان کی تیاری کیسے کریں'' ''پروفیسر محمد شفیع: ایک معروف و ممتاز جغرافیہ داں'' اور ''برصغیر میں اردو فاصلاتی تعلیم کا دائرہ کار'' وغیرہ بہت معلوماتی ہیں۔ میرا ایک مشورہ ہے کہ آپ انٹرویو لینے والے اور انٹرویو دینے والے دونوں حضرات کا مختصر تعارف قاری سے کروادیا کریں جس سے روبرو کا کالم اور جاندار ہوجائے۔

مجھے یہ پڑھ کر بے حد مسرت ہوئی کہ قومی کونسل نے جناب چندر بھان خیال صاحب جیسے ایک ایماندار نوجوان شاعر کو اپنا وائس چیئرمین بنا کر ان تمام لوگوں کا منھ بند کردیا ہے جو اردو کو ایک خاص مذہب، قوم اور صوبے کی زبان بتا کر اردو کو بدنام کرتے آئے ہیں۔

■ علیم صبا نویدی، 192، ٹرپلی کین ہائی روڈ، سیکنڈ فلور، فلیٹ نمبر 16، رائز منڈی اسٹریٹ، چنئی- 600005

تازہ شمارے کے مختلف باب مختلف النوع ہیں۔ ہر باب کے مضامین معلومات انگیز ہیں۔ فاروقی صاحب، رفعت سروش اور سید حامد کی تحریریں اس شمارے کی آبرو ہیں۔ سلیم اختر سے اسد فیض کی بات چیت میں بڑی تشنگی کا احساس ہوا۔ نہ جانے کیوں۔؟

□□□

مولانا آزاد کی سائنسی بصیرت

مصنف: وہاب قیصر

''مولانا آزاد کی سائنسی بصیرت'' میں ڈاکٹر وہاب قیصر نے مولانا آزاد کی سوانح، تحریریں، صحافت اور وزارت میں جہاں کہیں بھی سائنسی مزاج، سائنسی اصول اور سائنسی برتاؤ نظر آئے انھیں ضبط تحریر کیا ہے۔ پانچ ابواب پر مشتمل اس کتاب میں موصوف نے مولانا کے لیے سائنس کی تعلیم کا حصول، مولانا آزاد کا سائنسی شعور، غبار خاطر سائنس کے تناظر میں، البیرونی اور جغرافیۂ عالم اور مولانا آزاد اور ملک میں سائنس کی ترقی جیسے موضوعات سے بحث کی ہے۔

صفحات: 180، قیمت: -/109 روپے

تاریخ تعلیم ہند

مصنف: سیّد نور اللہ/ جے. پی. نائک، مترجم: مسعود الحق

اس کتاب میں 1765 سے 1947 تک ہندوستان میں عہد بہ عہد ہونے والی تعلیمی تبدیلیوں کا مجمل خاکہ پیش کیا گیا ہے۔ جدید تعلیمی تاریخ کی ہر اہم منزل پر ایک مکمل اور جامع تبصرہ کرنے، ہر اہم فیصلے کے پیچھے کارفرما اسباب اور ان کے اثرات کو سمجھانے اور یہ دکھانے کی کوشش کی گئی ہے کہ موجودہ نظام تعلیم کس طرح وجود میں آیا ساتھ ہی یہ بھی دکھانے کی کوشش کی گئی ہے کہ یہ تعلیمی اقدام صرف حال ہی کے سمجھنے میں معاون نہ ہو بلکہ مستقبل کی اصلاحات اور تنظیم نو کے رخ کی بھی نشان دہی کرے۔

صفحات: 552، قیمت: -/111 روپے

نوٹ: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دھلی کی جانب سے طلبہ اور اساتذہ کے لیے بالترتیب 45% اور 40% کی خصوصی رعایت دی جاتی ھے۔ تاجران کتب کو قومی اردو کونسل کے ضوابط کے مطابق رعایت دستیاب ھے۔ ادارہ

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، شعبۂ فروخت: ویسٹ بلاک-8، ونگ-7، آر. کے. پورم، نئی دہلی-110066

ہماری بات

ہندوستان ایک ایسا ملک ہے جہاں ہزاروں سال سے مختلف تہذیبوں اور ثقافتوں کا آپس میں میل جول ہوتا رہا ہے۔ اس تہذیبی اور ثقافتی رنگارنگی کی طرح یہاں بہت سی زبانیں بھی رائج رہی ہیں اور ان میں علمی، ادبی اور شعری کارنامے بھی سرانجام پائے ہیں۔

اردو، ہندوستان کی نسبتاً کم عمر زبانوں میں ہے۔ اس کے ابتدائی نقوش لگ بھگ ایک ہزار سال پہلے ابھرنے شروع ہوئے لیکن اس نے بڑی تیزی سے ترقی کی اور آج اس کا شمار دنیا کی بڑی زبانوں میں ہے۔ یہ برصغیر ہندوپاک کے علاوہ جہاں اس نے جنم لیا اور اپنے ارتقائی مدارج طے کیے، دنیا کے کئی ملکوں میں نہ صرف سمجھی اور بولی جاتی ہے بلکہ وہاں اس میں لکھنے پڑھنے کا کام کرنے والوں کی بھی خاصی تعداد موجود ہے۔ امریکہ اور یورپی ملکوں کے علاوہ، خلیجی ریاستیں اور سعودی عرب وغیرہ ایسی جگہیں ہیں جہاں سے اردو کی کتابیں، رسالے اور اخبار بھی شائع ہو رہے ہیں اور اسکول سے یونیورسٹی کی سطح تک اس کی تعلیم وتدریس کا نظام بھی قائم ہو چکا ہے۔

اردو اپنی ابتدا ہی سے عوام کی زبان رہی ہے، خواص نے اسے بہت بعد میں منہ لگایا۔ عوامی مزاج کا خاصہ یہ ہے کہ مختلف خیالات رکھنے والے بھی ایک دوسرے سے الگاؤ یا اجنبیت کا برتاؤ نہیں کرتے۔ ایک عوامی زبان ہونے کی وجہ سے اردو کا بھی یہی مزاج رہا ہے۔ اردو کی ہمجولی زبانیں ہوں یا پرانی زبانیں، اس نے کسی زبان کو غیر نہیں سمجھا۔ سب پر اپنے دروازے کھلے رکھے، ان غیر ملکی زبانوں پر بھی جو تاریخ کے مختلف ادوار میں ہندوستان میں مروج ہوئیں مثلاً عربی، فارسی، ترکی، انگریزی اور پرتگیزی زبانیں۔ اس نے ان سبھی زبانوں سے استفادہ کیا، جہاں سے جو ملا قبول کیا اور اپنے سانچے میں ڈھال لیا۔ اس طرح اردو کا ذخیرۂ الفاظ بڑھتا گیا، اس کے اسالیب بیان نکھرتے گئے اور شعروادب کی اصناف میں بھی بڑی رنگارنگی آ گئی۔

زبانوں کا کوئی مذہب نہیں ہوا کرتا۔ اردو بولنے والوں اور اردو لکھنے والوں میں بھی مختلف مذہبوں کے ماننے والے شامل رہے ہیں۔ ہندو، مسلمان، سکھ، عیسائی، جینی یہ سبھی فرقوں کی زبان رہی ہے۔ نہ صرف بول چال کی بلکہ لکھنے پڑھنے کی زبان بھی۔ اردو کے قدیم شعرا کے تذکرے ہوں یا جدید ادبی تاریخیں، سبھی میں مختلف مذاہب سے تعلق رکھنے والے شاعروں اور ادیبوں کے نام اور ان کے شعری اور ادبی کارناموں کا ذکر نظر آئے گا۔ اردو علاقائی حد بندیوں کی بھی کبھی اسیر نہیں رہی۔ شمال سے جنوب تک اور مشرق سے مغرب تک، اس نے ہر جگہ رسائی پائی اور اپنے قدم جمائے۔

آزادی کے بعد کچھ حلقوں کی طرف سے اردو کے بارے میں معاندانہ رویہ اختیار کیا گیا، اور کچھ ایسی باتوں کو ہوا دی گئی جو بے بنیاد تھیں۔ ملک کی تقسیم کی ذمے داری بھی اس زبان پر ڈالنے کی کوشش کی گئی۔ مگر جن باتوں کی بنیاد سچ پر نہ ہو، وہ جلد ہی اپنا اعتبار کھو دیتی ہیں اور بے اثر ہو جاتی ہیں چنانچہ اردو کے بارے میں جو منفی باتیں پھیلائی گئی تھیں ان کا اثر بھی اب بڑی حد تک زائل ہو چکا ہے۔

بہار ہندوستان کے ان صوبوں میں ہے، جہاں نامساعد حالات میں بھی اردو کو سازگار ماحول میسّر آیا۔ وہاں سب سے پہلے اردو کو دوسری سرکاری زبان کی حیثیت بھی حاصل ہوئی۔ اسی صوبۂ بہار کا ایک مقام مونگیر ہے جو علم و ادب کا گہوارہ رہا ہے۔ خانقاہ رحمانی اسی میں واقع ہے جو 1901 میں قائم ہوئی تھی۔ اردو زبان و ادب کی پرورش و پرداخت میں خانقاہوں اور خانقاہوں کی پروردہ شخصیتوں نے جو حصہ لیا ہے وہ محتاج بیاں نہیں۔ اس سلسلے میں موجودہ زمانے کے حوالے سے خانقاہ رحمانی کی خدمات بہت نمایاں ہیں۔ خانقاہ سے دو ذیلی ادارے وابستہ ہیں: جامعہ رحمانی اور رحمانی فاؤنڈیشن۔ جامعہ رحمانی خانقاہ کے بانی مولانا محمد علی مونگیری نے قائم کیا تھا۔ یہ ایک تعلیمی اور تربیتی ادارہ ہے جہاں دینی تعلیم کے علاوہ بعض دنیوی علوم مثلاً جغرافیہ، حساب اور سائنس کی بنیادی تعلیم بھی دی جاتی ہے اور ذریعۂ تعلیم اردو ہے۔ رحمانی فاؤنڈیشن کا قیام 1996 میں عمل میں آیا، اس کے نگراں مولانا محمد ولی رحمانی ہیں، جن کی شخصیت میں دینی اور دنیوی علوم دونوں جمع ہو گئے ہیں۔ یہ ادارہ مختلف فلاحی کاموں کے علاوہ اب کمپیوٹر کی تعلیم بھی دے رہا ہے، جس میں قومی اردو کونسل کا تعاون شامل ہے۔

4،3 اور 5 مئی کو ان تینوں اداروں کے تعاون سے قومی اردو کونسل نے ایک سہ روزہ سیمینار بہ عنوان "جنگ آزادی میں بہار اور بنگال کا حصہ اور اردو زبان و ادب" منعقد کیا۔ سیمینار بہت کامیاب رہا اور اس میں جو مقالے پڑھے گئے، ان سے جنگ آزادی کے بہت سے ایسے پہلو روشن ہوئے جنھیں گزرتے ہوئے وقت نے دھندلا دیا ہے۔ سیمینار کی روداد جو مختلف اردو اور ہندی اخباروں میں شائع شدہ خبروں پر مبنی ہے، "خبرنامہ" میں شائع کی جارہی ہے۔ سیمینار میں پڑھے جانے والے مقالات سے ایک بار پھر یہ حقیقت کھل کر سامنے آئی کہ اردو کی جڑیں ہندوستانی مٹی میں کتنی گہرائی تک پیوست ہیں اور اس زبان نے گزشتہ صدیوں میں قومی زندگی کے ہر اہم موڑ پر کتنا سرگرم کردار ادا کیا ہے۔

□□□

شمس الرحمٰن فاروقی

اچھی اردو: روزمرہ، محاورہ، صرف

سوال: ''خوب صورت''، دو لفظوں کا مرکب ہے۔ تو کیا یہ کہنا درست ہے کہ ''وہ خوبصورت چہرے کے مالک ہیں''؟

جواب: ''خوبصورت'' دو لفظوں کا مرکب ہے لیکن ایک لفظ ہے، یہ معنی ''حسین، خوشگوار، اچھا''۔ اس طرح کے اور بھی لفظ اردو میں ہیں۔ خود ''خوب'' کے ساتھ بہت سے لفظ بنتے ہیں: خوب رو؛ خوب روئی؛ خوب سیرت؛ خوب طبع۔ ان کے ساتھ کوئی بھی مناسب لفظ لگ سکتا ہے۔ لیکن آپ نے جو جملہ بنایا ہے وہ اردو محاورے سے ذرا الگ ہوگیا ہے۔ کسی کا چہرہ خوبصورت ہو سکتا ہے، لیکن کوئی خوبصورت چہرے کا مالک ہو، یہ اردو میں نہیں ہے، بشرطیکہ ''خوبصورت چہرہ'' استعارے کے طور پر کسی اور شخص کے لیے استعمال کیا گیا ہو۔ پھر بھی، یہ بہت اچھا جملہ نہ ہوگا۔

(سوال از حبیب تشنہ، مالونی، ممبئی-400095)

سوال: قواعد نویسوں نے مذکر اور مونث کے لیے ''حقیقی'' اور ''غیر حقیقی'' کی اصطلاحیں بنائی ہیں۔ مگر بابائے اردو نے صرف ایک جنس مشترک کا ذکر کیا ہے اور مثال میں لفظ ''بچہ'' لکھا ہے، حالانکہ اردو میں ''بچہ'' کا مونث ''بچی'' موجود ہے۔ میرا خیال ہے اردو میں جنس مشترک ہوتی ہی نہیں کیونکہ ہر اسم کی کوئی جنس ہوتی ہے، خواہ وہ اسم جاندار ہو یا بے جان۔ جن قواعد نویسوں نے ''غیر حقیقی'' کی شق بنا کر بیجان اور جاندار کا فرق کیا ہے، وہی صحیح معلوم ہوتا ہے۔ آپ کی رائے کیا ہے؟

جواب: بابائے اردو نے ''بچہ'' کو جنس مشترک کہا تو اس کی وجہ یہ تھی کہ عموی صورت میں ہم کسی بچے یا بچی کے بارے میں کہتے ہیں، ''یہ میرا بچہ ہے۔'' یا ''یہ میرا بچہ نہیں ہے۔'' جب ''بچہ'' کا مونث ''بچی'' بولتے ہیں تو اس سے صرف وہی بچہ مراد ہوتا ہے جو جنس اناث میں سے ہو۔ ''حقیقی'' اور غیر حقیقی'' کی تفریق ہم لوگوں نے عربی کی طرز پر بنائی ہے۔ عربی میں قاعدہ یہ ہے کہ جس لفظ میں علامت تانیث ہو اسے ''مونث لفظی'' کہتے ہیں، اور جس لفظ کو اہل زبان مونث بولتے ہیں اگر چہ اس میں علامت تانیث نہ ہو، اسے ''مونث معنوی'' کہتے ہیں۔ اردو میں چونکہ کوئی علامت تانیث ایسی نہیں جو ہر جگہ کارآمد ہو، لہٰذا یہاں یہ اصول بنایا گیا کہ جس لفظ کو فطری طور پر مونث یا مذکر بولا جاتا ہے اسے مونث یا مذکر حقیقی کہیں گے۔ مثلاً ماں (مونث حقیقی)؛ باپ (مذکر حقیقی)۔ باقی اور الفاظ کی جو جنس ہو اسے غیر حقیقی کہا جاتا ہے۔ اس سلسلے میں جاندار اور بیجان کی تفریق کچھ زیادہ کارآمد نہیں، کیونکہ ہمارے یہاں بہت سی ایسی چیزیں اور جانور ہیں جن کی کوئی تانیث نہیں، اور بہت سی ایسی چیزیں اور جانور ہیں جن کی کوئی تذکیر نہیں۔ زیادہ اچھا ہے کہ ہم یہ مان لیں کہ اردو میں مذکر مونث کا تعین تقریباً ہمیشہ سماعی ہے، قیاسی نہیں۔ ہر لفظ کی جنس سیکھنی پڑتی ہے، وہ حقیقی ہو یا غیر حقیقی۔

(سوال از سالکہ خاتون صدیقی، معرفت پروفیسر قاضی مظہر علی، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ)

سوال: کیا ''مصروفیت''، ''مشغولیت'' کی طرح ''معتبریت'' اور ''مغلوبیت'' بھی بول سکتے ہیں؟

جواب: ''معتبریت'' اور ''مغلوبیت'' رائج نہیں ہیں، لہٰذا ابھی یہ روزمرہ اور محاورے کے خلاف کہے جائیں گے۔ میں ان کے استعمال کی رائے نہ دوں گا۔

(سوال از تجمل حسین انصاری، نظام پورہ، بھیونڈی)

سوال: مندرجۂ ذیل جملوں میں سے کون سا جملہ درست ہے:

(1) مندرجۂ ذیل سوالات میں سے کسی پانچ سوالوں کا جواب لکھیے۔

(2) مندرجۂ ذیل سوالات میں سے کن ہی پانچ سوالوں کا جواب لکھیے۔

جواب: دونوں ہی غلط ہیں۔ ''کسی'' واحد ہے، لہٰذا اسے جمع کے لیے نہیں استعمال کر سکتے۔ اور ''کن ہی/کنھی/کنھیں/کنہی/کنہیں'' اردو میں نہیں ہیں۔ جملہ یوں صحیح ہوگا:

(3) مندرجۂ ذیل [سوالات] میں سے پانچ سوالوں کے/کا جواب لکھیے۔

''سوالات'' غیر ضروری ہے اس لیے میں نے اسے گھیر دیا ہے۔ اسے

باقی رکھا جائے تو غلط نہ ہوگا۔

(سوال از ابومظہر خالد صدیقی، مولانا آزاد اردو یونیورسٹی، حیدرآباد)

سوال: سلمہٗ، سلمہا، مدظلہٗ، دام برکاتہم کے معنی بتائیں۔

جواب: یہ عربی دعائیہ کلمات ہیں اور میرے دائرے کے باہر۔ بہرحال، معنی حسب ذیل ہیں:

سلمہٗ = خدا اس کو سلامت رکھے (مذکر)؛ سلمہا = خدا اس کو سلامت رکھے (مونث)؛ مدظلہٗ = اس کا سایہ پھیلے، یا قائم رہے؛ دام برکاتہم (یادامت برکاتہم) = ان کی برکتیں ہمیشہ رہیں۔

سوال: باادب، باملاحظہ، ہوشیار کے کیا معنی ہیں؟

جواب: یہ الفاظ، یا ان میں سے کوئی لفظ، مغل زمانے میں بادشاہ کے نمودار ہونے، یا بادشاہ کے سامنے حاضری کے وقت بولے جاتے تھے۔

باادب = ادب ملحوظ رکھو؛ باملاحظہ = نظر صحیح جگہ رکھو، محتاط رہو؛ ہوشیار = متوجہ رہو، محتاط رہو۔

سوال: لفظ ''کورنش'' کا صحیح تلفظ کیا ہے؟

جواب: اردو میں اس کا تلفظ بروزن فاعلن ہے، واؤ معروف اور ن پر زیر۔ ترکی میں اس کا تلفظ 'کرنُش' ہے، لیکن ہمیں اس سے کوئی مطلب نہیں۔

(سوالات از رفعت جمیل انصاری، کتراس گڑھ، دھنباد)

□□□

فورٹ ولیم کالج کے نسخۂ کلیات میر (مطبوعہ 1811) کے بعد کلام میر کا صحیح ترین اور مکمل ترین نسخہ

کلیات میر (دو جلدوں میں)

جلد اول (مکمل چھ دیوان غزلیات) صفحات: 870 ● قیمت 402 روپے مجلد، 336 روپے غیر مجلد ● سائز: 20X26X8

مرتب: ظل عباس عباسی ● بہ تصحیح و اضافہ: احمد محفوظ ● زیر نگرانی: شمس الرحمٰن فاروقی

جلد دوم (قصیدہ، مثنوی، مرثیہ وغیرہ) صفحات: 632 ● قیمت 430 روپے مجلد، 410 روپے غیر مجلد

تحقیق و ترتیب: احمد محفوظ ● زیر نگرانی: شمس الرحمٰن فاروقی

- اس نسخے کو تمام اہم اور قابل ذکر مطبوعہ نسخوں کو سامنے رکھ کر تیار کیا گیا ہے اور بقدر ضرورت قلمی نسخوں سے بھی مدد لی گئی ہے۔
- کلام میر میں مستعمل بے شمار نادر اور نامانوس الفاظ کی صحت و درستی کو بڑی حد تک یقینی بنایا گیا ہے۔
- نسخۂ عباسی جو صرف غزلیات پر مشتمل تھا اس میں نسخۂ محمود آباد سے بہت سارا کلام لے کر اضافہ کیا گیا ہے۔ اس طرح اب جلد اول میں غزلیات کی کل تعداد 1916 ہے جو ابھی تک کے تمام مطبوعہ نسخوں سے زیادہ ہے۔ غزلیات میں اشعار کی کل تعداد 13908 ہے۔
- جلد دوم میں میر کے تمام مرثیوں کو پہلی بار پوری صحت کے ساتھ مکمل صورت میں سامنے لایا گیا ہے۔
- جلد دوم میں منظومات کو پہلی بار بالکل نئی، مناسب اور بااصول ترتیب سے رکھا گیا ہے۔ اس طرح نسخے میں شامل کسی بھی منظومے کو تلاش کر لینا آسان ہو گیا ہے۔
- دونوں جلدوں میں متن کی تصحیح کے دوران مختلف مستند اور بعض نادر لغات اور فرہنگوں کا سہارا لیا گیا ہے۔
- جلد دوم میں دو تفصیلی دیباچے شامل ہیں۔ احمد محفوظ کے دیباچے میں کلام میر کی تدوین و تصحیح متن سے متعلق نہایت اہم امور زیر بحث لائے گئے ہیں۔ شمس الرحمٰن فاروقی کے دیباچے میں مثنویات میر اور میر کے عمومی کلام پر ایک بالکل نئے پہلو سے گفتگو کی گئی ہے۔
- جلد اول میں دیگر مضامین کے علاوہ شمس الرحمٰن فاروقی کا دیباچہ نما ایک نیا مضمون ''تمہید'' کے عنوان سے شامل ہے۔
- ان دونوں جلدوں کو بڑے سائز پر سفید کاغذ اور عمدہ کمپوزنگ کے ساتھ شائع کیا گیا ہے اور سرورق ایسا ہے جو میر کے زمانے کی تہذیبی و ثقافتی روایت کی عکاسی کرتا ہے۔

کلیات میر (جلد اول و دوم) ملک کے تمام بڑے کتب فروشوں کے یہاں دستیاب ہے۔ اردو کونسل سے براہ راست بھی طلب کی جا سکتی ہے۔

ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک-1، آر.کے. پورم، نئی دہلی-110066

محمد ہاشم قدوائی

اردو رسم الخط

اردو کے جائز حقوق کو تسلیم کرنے میں سب سے بڑی مخالف دلیل یہ پیش کی جاتی ہے کہ اس کا رسم الخط بہت ہی پیچیدہ اور ناقص ہے جس کو سیکھنا بڑا مشکل ہے۔ اس کے تلفظ اور املا میں برابر غلطیاں ہوتی رہتی ہیں لیکن یہ اعتراضات سرتاسر بے بنیاد مفروضات پر مبنی ہیں۔

بہ قول مولانا عبدالماجد دریابادی" کسی بھی رسم الخط کی اچھائی اور برائی کو جانچنے کے دو معیار ہیں۔ 1. صوتی یعنی آواز کے اعتبار سے جچے لگانا۔ 2. کتابت یا خوش خطی کے اعتبار سے لسانیات کے مسلمہ اصولوں کے تحت مکمل حروف تہجی وہی کہے جاسکتے ہیں جو ہر قسم کی آواز کو کسی علامت سے ظاہر کریں اور اس آواز کی مختلف ہیئتوں ترکیبوں اور تبدیلیوں کی صاف طور پر وضاحت کریں جن کے معنی اور مفہوم ایک دوسرے سے الگ ہوتے ہیں۔"

حروف ابجد یا حروف تہجی کا بنیادی کام یہ ہے کہ بولی جانے والی زبان کو مناسب علامتوں سے صاف صاف ظاہر کریں اور اسی لیے وہی ابجد جامع اور مکمل کہی جائے گی جس کے حروف آواز اور لہجے سے پورے طور پر ہم آہنگ ہوں اور اس کے اتار چڑھاؤ کو بخوبی ظاہر کریں۔

اس روشنی میں اردو رسم الخط کا جائزہ لیا جائے تو اردو کے حروف تہجی دوسری زبانوں کے حروف تہجی سے کہیں زیادہ مکمل اور بہتر ہیں۔ یہ طویل اور مختصر آوازوں کو ٹھیک ٹھیک ظاہر کرتے ہیں۔ اردو حروف تہجی میں دس حروف علت موجود ہیں جن کی تفصیل یہ ہے۔

1. تین اصل حروف علت جن کو الگ حرفوں سے ظاہر نہیں کیا جاتا بلکہ ان کی جگہ زیر، زبر، پیش کا استعمال کیا جاتا ہے۔
2. تین متعلقہ طویل حروف علت جو چھوٹے حروف علت کے فوراً بعد استعمال کیے جاتے ہیں، کھینچ کر بولے جاتے ہیں۔ مثلاً الف میں پہلے حرف پر زبر کی حرکت ہوتی ہے تو وہ کھینچ کر بولا جاتا ہے۔ اس طرح واؤ سے پہلے اگر حرف صحیح پر پیش کی حرکت ہو تو وہ کھینچ کر بولا جائے گا۔
حرف ی سے پہلے اگر حرف صحیح پر زیر لگا ہو تو اس کو کھینچ کر بولا جائے گا۔
3. دو مرکب حرف علت ہوتے ہیں۔ اگر ی سے پہلے حرف صحیح پر زبر لگا ہو تو اسے اے پڑھا جائے گا۔ اس طرح جب واؤ سے قبل حرف صحیح پر پیش لگا ہو تو اسے او پڑھیں گے۔
4. دو طویل حرف علت ہیں جن کو مجہول بھی کہا جاتا ہے۔ یہ لفظ ی اور واؤ ہیں۔ ی کی آواز اے کی طرح ہوتی ہے اور واؤ، او کی طرح بولا جاتا ہے۔

اردو کے موجودہ حروف تہجی عربی، فارسی، ہندی حروف اور علامتوں پر مشتمل ہیں۔ ان میں پ ٹ ڈ ڑ ژ چ اور گ غیر عربی ہیں۔ اس وجہ سے اردو ابجد صوتی اعتبار سے دوسری زبانوں کے مقابلے میں کہیں زیادہ مکمل اور جامع ہے۔

ایک ماہر لسانیات سر ولیم کا کہنا ہے کہ" اسی زبان کو مکمل کہا جاسکتا ہے جو انسانی دماغ میں پیدا ہونے والے ہر خیال کو ایک خاص لفظ کے ذریعے صفائی اور زور سے ادا کرسکے۔ اس اصول کے تحت ایسی زبان میں حروف کا ایک مکمل اور مربوط نظام ہوتا ہے جو ہر آواز کا تلفظ ٹھیک ٹھیک ادا کرسکے۔"

یہ خصوصیت اردو کے حروف تہجی میں بدرجہ اُتم پائی جاتی ہے۔ حروف علت ہر قسم کی آواز کو ظاہر کرتے ہیں اور حروف صحیح آسانی سے شروع اور آخر میں ادا کیے جاسکتے ہیں۔ حروف علت حروف صحیح کے صحیح تلفظ اور لہجے کا نظم قائم رکھنے کا فرض انجام دیتے ہیں۔

اردو کا خط نستعلیق ایک قسم کا شارٹ ہینڈ (مختصر زودنویسی) ہے۔ اس میں ہر حرف کہیں مختصر کہیں طویل آواز دیتا ہے حرفوں کو آپس میں جوڑ کر لکھنے سے اردو رسم الخط بڑا آسان ہوگیا جس میں وقت بھی کم لگتا ہے اور جگہ بھی کم گھرتی ہے۔ لکھنے والے اور پڑھنے والے دونوں کی وقت اور توانائی میں بچت ہوتی ہے۔

اردو بولنے والوں سے اتنا عمدہ رسم الخط چھوڑ کر رومن یا دیوناگری رسم الخط اختیار کرنے کی فرمائش ان کو خودکشی کی دعوت دینے کے مترادف ہے اور اس پر عمل کرنے سے اردو زبان کا خاتمہ ہوجائے گا۔

□□□

پتہ:

C501,
Rose Wood Apartments,
Mayur Vihar,
New Delhi-110091

محمد اختر صدیقی

اردو میڈیم اسکولوں کے مسائل

1957 میں لسانی اقلیتوں کے کمشنر نے جب اپنی پہلی سالانہ رپورٹ پیش کی تو اس وقت کے وزیراعظم پنڈت جواہر لعل نہرو نے اس رپورٹ پر اپنا ردِعمل پیش کرتے ہوئے یہ خدشہ ظاہر کیا تھا کہ اردو کے ساتھ کیا جانے والا سلوک جزوی طور پر ثابت کرتا ہے کہ شاید ملک پھر سے فرقہ واریت کی طرف لوٹ رہا ہے۔ اردو کے تئیں وزیراعظم کے اس مشاہدے کے نتیجے میں جولائی 1958 میں مرکزی وزارت داخلہ نے تمام ریاستوں کے نام ایک پریس نوٹ جاری کیا تھا جس میں فروغ اردو کے لیے مختلف سہولتیں مہیا کروانے کی سفارشات کی گئی تھیں جن میں بالخصوص یہ بات شامل تھی کہ وہ بچے جن کی مادری زبان اردو ہے انھیں ابتدائی اور ثانوی سطحوں پر اردو کے ذریعے تعلیم اور امتحان دلوانے کی سہولت مہیا کروائی جائے۔ اس سہولت کی مزید وضاحت کرتے ہوئے یہ بھی کہا گیا تھا کہ اردو میڈیم اساتذہ کی تیاری اور اردو زبان میں کتابوں کی دستیابی کا اہتمام کیا جائے۔ گو بعد کے برسوں میں شائع ہونے والی لسانی اقلیتوں کے کمشنر کی رپورٹوں کے مطابق ہندی اردو ریاستوں اور غیر ہندی اردو ریاستوں میں اردو میڈیم اسکولوں اور طلبہ کی تعداد میں بتدریج اضافہ تو ہوا ہے لیکن جہاں تک ان اسکولوں اور ان میں پڑھنے والے طلبہ کے تعلیمی معیار اور علمی حصولیابی کا معاملہ ہے اس میں عموماً گراوٹ آئی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ موجودہ وزیراعظم کی مقرر کردہ سچر کمیٹی نے اپنی رپورٹ میں اردو میڈیم طلبہ کی بالعموم کمزور کارکردگی پر اپنی گہری تشویش کا اظہار کیا ہے۔ اس کے اسباب کا تجزیہ پیش کرتے ہوئے کمیٹی اس نتیجے پر پہنچی ہے کہ اردو میڈیم طلبہ کی یہ کمزور کارکردگی ایک ایسے دائرے کو جنم دیتی ہے جس میں اردو کی عملی افادیت میں کمی آجاتی ہے۔ اس کے نتیجے میں اردو پڑھنے والوں کی مانگ میں کمی آجاتی ہے اور مانگ میں یہ کمی انتظامیہ کو اردو کی تدریس کی سہولتوں میں کمی کرنے کا معقول جواز فراہم کر دیتی ہے۔ اردو میڈیم اسکولوں اور ان میں پڑھنے والے طلبہ کی کمزور کارکردگی کے لیے محض ان طلبہ اور انتظامیہ کی اور ان کی جانب کم توجہی کو ذمے دار ٹھہرانا شاید بہت مناسب نہیں ہے۔ اگر اسی دلیل کو دیگر علاقائی زبانوں اور قومی زبان ہندی کے ذریعے تعلیم دینے والے اسکولوں پر لاگو کیا جائے تو ہم ردِعمل اس کے برعکس دیکھیں گے۔ یہاں بیشتر سرکاری اسکولوں کو کمزور کارکردگی کے باوجود ان کی سہولتوں میں اس بنا پر کوئی کمی نہیں کی جاتی۔ بلکہ انھیں مزید مضبوط اور بہتر بنانے کی کوشش کی جاتی ہے تاکہ ان کا تعلیمی معیار بہتر ہو سکے۔ اردو میڈیم اسکولوں کے ساتھ ایسا کیوں نہیں ہوتا؟ اس بات کا جواب حاصل کرنے کے لیے یہ سمجھنا ضروری ہوگا کہ اردو میڈیم اسکول، ہندی میڈیم اسکول اور علاقائی زبانوں کے اسکولوں کا سماجی و سیاسی پس منظر بہت مختلف ہے۔

اردو میڈیم اسکولوں کے بہت سے مسائل علاقائی زبانوں اور خود قومی زبان ہندی کے ذریعے تعلیم دینے والے اسکولوں کے مسائل سے جداگانہ ہیں۔ ان مسائل کے بہت سے اسباب ہو سکتے ہیں لیکن ایک اہم اور بنیادی سبب یہ ہے کہ دیگر تمام اہم ہندوستانی زبانوں کے اپنے علاقے اور اپنی اپنی ریاستیں ہیں اور ان کے بولنے والوں کی اکثریت ان علاقوں اور ریاستوں میں آباد ہے۔ مثلاً تمل، تیلگو، بنگلہ، ملیالم وغیرہ کی اپنی اپنی ریاستیں ہیں۔ بہت سی ایسی ریاستیں بھی ہیں جہاں کوئی علاقائی زبان نہیں، قومی زبان ہندی بولی جاتی ہے جیسے مدھیہ پردیش، راجستھان، اتر پردیش وغیرہ۔ دونوں صورتوں میں صوبائی حکومتیں اور ہندی بولی جانے والی ریاستوں میں مرکزی حکومت بھی ان زبانوں کی تعلیم اور ان زبانوں کے ذریعے تعلیم کی پوری ذمے داری اپنے اوپر لیے رہتی ہیں۔ چنانچہ ان تمام ریاستوں میں چلنے والے علاقائی زبان یا ہندی میڈیم اسکولوں کو براہِ راست حکومت کی سرپرستی اور معاونت حاصل ہوتی ہے۔ صوبے کی سرکاری زبان ہونے کے ناتے ہر علاقائی زبان کو فروغ پانے کا بھرپور موقع ملتا ہے۔ علاقے کی اکثریت کی زبان ہونے کے سبب اکثر اسکولوں میں ذریعۂ تعلیم یہی علاقائی زبان ہوتی ہے۔ اسکولوں میں اساتذہ کی تقرری، تدریس، نصابی کتابوں کی تیاری اور فراہمی، اساتذہ کی تربیت اور امتحانات وغیرہ یہ سبھی کام علاقائی زبان میں سرکاری نظم میں بہ آسانی چلتے رہتے ہیں۔ اس کا سبب صرف یہ نہیں ہے کہ علاقائی زبان صوبے کی سرکاری زبان ہے اور اس لیے صوبائی سرکار اس کے فروغ اور اس کے ذریعے تعلیم کے انتظام کی پابند ہے بلکہ اس کا ایک بڑا سیاسی و سماجی سبب یہ بھی ہے کہ اس صوبے کی دستور ساز اسمبلی میں صوبے سے منتخب ہو کر آنے والے اور تمام قوانین بنانے والے اکثر نمائندے خود اس علاقائی زبان کے بولنے والے اور اس زبان کے ہمدرد ہوتے ہیں اور وہ اس علاقائی زبان کی بقا و فروغ کے لیے ہر ممکن قانون وضع کرنے پر قدرت رکھتے ہیں چنانچہ ایسے قوانین بناتے ہیں جن سے ان کے ہم علاقہ اور ہم زبان شہریوں کے لسانی حق کا تحفظ کیا جا سکے۔ بالکل اسی طرح

اس صوبے میں کام کرنے والے اعلیٰ افسران جو قانون ساز اسمبلی کے فیصلوں اور قوانین کے عملی جامہ پہنانے کے لیے ذمے دار ہوتے ہیں اور ان کے ماتحت نچلے درجے کے افسر اور کارکن، سبھی اس علاقائی زبان کے بولنے والے ہوتے ہیں ثقافتی، جذباتی اور نفسیاتی طور پر علاقائی زبان سے ان کا رشتہ فطری ہوتا ہے اور ان قوانین کو عملی جامہ پہنانا نہ صرف ان کی منصبی ذمے داری ہوتی ہے بلکہ اس سمت میں ان کی تمام کارگزاری اپنی علاقائی زبان کے تئیں ایک اہم سماجی خدمت ہوتی ہے اور اپنے ہم زبانوں کے لسانی حق کے تحفظ کا عملی نمونہ بھی، اس طرح وہ ہم زبانوں اور ان کے ذریعے تعلیم دینے والے اداروں کو بیک وقت سیاستدانوں، قانون سازوں اور انتظامیہ کی بھرپور ہمدردی اور عملی معاونت حاصل ہوتی ہے چنانچہ علاقائی زبانوں کے ذریعے تعلیم دینے والے اسکولوں کی حالت بحیثیت مجموعی بہتر ہوجاتی ہے اور تعلیمی اہداف کی حصولیابی کی بہتر صلاحیت کے سبب ان کا تعلیمی معیار بہتر ہونے کے امکانات پوری طرح روشن رہتے ہیں۔

اردو زبان کی صورت حال بالکل مختلف ہے۔ اردو کا نہ اپنا کوئی مخصوص علاقہ ہے نہ کوئی مخصوص ریاست جہاں اسے بطور خاص دستوری یا سیاسی یا انتظامی دفتری سرپرستی اور حمایت حاصل ہوسکے۔ اس کے بولنے والے ہندوستان کے مختلف صوبوں میں بکھرے ہوئے ہیں اور جموں وکشمیر کو چھوڑ کر جس صوبے میں بھی یہ ہیں اقلیت میں ہیں جس کی بنا پر ان کی زبان کے مسائل پر، اس زبان کے ذریعے دی جانے والی تعلیم کے اداروں اور ان کے مسائل پر بھرپور توجہ نہیں ہو پاتی ہے۔ اردو زبان کی اس بے سروسامانی اور اس کے سبب اس کی تدریس کی جانب سے بے توجہی کی طرف نئی تعلیمی پالیسی 1986 کے اطلاق پر نظرثانی کرنے والی راما مورتی کمیٹی (1990) نے بھی اشارہ کیا تھا۔ اردو سے اسی عام لاتعلقی کی بنا پر مرکزی حکومت کے متعلقہ قوانین بالخصوص دستور کی دفعہ 350A پر بھی خاطرخواہ توجہ نہیں ہو پاتی ہے۔ چنانچہ مہاراشٹرا کو چھوڑ کر جس ریاست میں بھی اردو میڈیم اسکول قائم کیے گئے ہیں ان کی حالت اکثر کمزور ہی نظر آتی ہے اور ان کی تعلیمی حصولیابی ریاست کی اوسط تعلیمی حصولیابی سے نیچے ہی رہتی ہے۔

اردو میڈیم اسکولوں کی کمزور حالت ایک سیاسی، ثانوی، انتظامی، ثقافتی نفسیاتی اور تعلیمی مسئلہ ہے۔ اتنے پہلوؤں کے سبب یہ مسئلہ خاصا پیچیدہ ہے۔ بعض ریاستوں جیسے بہار اور دہلی میں اس مسئلے کے سیاسی پہلو کو ایک محدود حد تک حل کرنے کی کوشش کی گئی ہے مگر یہ حل تا حال پوری طرح بارآور نہیں ہو پایا ہے۔ یہاں اردو کو دوسری سرکاری زبان تو تسلیم کرلیا گیا ہے مگر اس فیصلے کے اطلاق اور اردو زبان کے فروغ کے لیے کوئی ٹھوس اور واضح قدم نہیں اٹھائے گئے ہیں۔ اس میں جہاں سیاست دانوں کی مصلحت پسندی، ووٹ بینک میں نفع ونقصان کی فکر، غیر ہمدردانہ، غیر منصفانہ اور غیر مخلصانہ رویے کا دخل ہے وہیں افسرانِ حکومت کا جانبدارانہ طریقۂ کار بھی پوری طرح کارفرما پایا جاتا ہے۔ حکومت کے فیصلوں کے باوجود وہ اردو میڈیم اسکولوں کے تئیں اپنی ذمے داری سے روگردانی کرتے ہوئے پائے جاتے ہیں۔ مثال کے طور پر ضلع مشرقی چمپارن میں 600 سے زائد ای. جی. ایس. مراکز کو ابتدائی اسکولوں میں تبدیل کیا گیا۔ ان میں سو کے قریب مراکز اردو بولنے والوں کے علاقوں میں تھے۔ غیر اردوداں طبقے کے علاقوں میں ای. جی. ایس. مراکز کی جگہ پرائمری اسکول کھول دیے گئے اور اردو بولنے والوں کے علاقوں میں یہ کہہ کر کوئی نیا پرائمری اسکول نہیں کھولا گیا کہ وہاں بچوں کی تعداد نیا اسکول کھولنے کے لیے ناکافی ہے۔ چنانچہ اردو بولنے والے بچوں کو آس پاس کے غیر اردو میڈیم اسکولوں میں رجسٹر کروادیا گیا۔ ایس. ایس. اے. کے تحت ابتدائی اسکولوں میں پڑھنے والی تمام لڑکیوں اور ایس ٹی اور ایس سی طلبہ کو نصابی کتابیں مفت تقسیم کی جاتی ہیں۔ اس صوبے کے کئی ضلعوں میں غیر اردو میڈیم کی یہ کتابیں اپریل، مئی اور جون میں تقسیم کردی گئیں لیکن اردو میڈیم اسکولوں اور دیگر اسکولوں میں اردو میڈیم کی طالبات کے لیے یہ نصابی کتابیں ماہ دسمبر تک بھی مہیا نہیں کروائی جاسکیں۔ افسران اعلیٰ سے معلومات کرنے پر علم ہوا کہ اسکولوں اور ضلعوں کے افسران نے اردو کی کتابوں کی مانگ ہی آگے نہیں بھیجی۔ بعض جگہ اردو میڈیم کی کتابیں دیگر میڈیم کی تمام کتابیں چھپ جانے کے بعد اتنی تاخیر سے چھپوائی گئیں کہ اساتذہ نے مجبوراً بچوں کو ہندی میڈیم کی کتابیں دے دیں اور اس میڈیم میں انھیں پڑھایا گیا۔ ان کی علمی حصولیابی پر اس کا اثر پڑنا ناگزیر تھا۔

اردو میڈیم اساتذہ کی تربیت ایک اور اہم مسئلہ ہے۔ ان کی قبل از ملازمت تربیت کا پورے ملک میں خال خال ہی کہیں اہتمام ہے۔ اگر جامعہ ملیہ اسلامیہ اور مہاراشٹر کے ان چند ٹیچر ٹریننگ اداروں کو جہاں اردو میڈیم اساتذہ کی تربیت کا کچھ انتظام ہے الگ کرکے دیکھیں تو اردو میڈیم اساتذہ کی ابتدائی تربیت کے وسائل نہ کے برابر رہ جائیں گے۔ اسی طرح دوران ملازمت تربیت اساتذہ کے وہ پروگرام جن میں اردو میڈیم اسکولوں کے اساتذہ کو مدعو کیا جاتا ہے، وہاں بارہا یہ شکایت سامنے آئی ہے کہ تربیتی ماڈیول/اسباق اکثر علاقائی زبانوں یا ہندی میں تیار کروائے اور تقسیم کیے جاتے ہیں جن کا اردو میڈیم اساتذہ خاطرخواہ فائدہ نہیں اٹھاپاتے۔ اسی طرح جن ماہرین کو ان پر پروگراموں میں مدعو کیا جاتا ہے وہ اکثر اردو سے نابلد ہوتے ہیں اور اپنے محاضرات ہندی یا علاقائی زبانوں میں پیش کرتے ہیں۔ یہاں بھی اردو میڈیم اساتذہ کوئی خاص استفادہ نہیں کرپاتے ہیں جس کے نتیجے میں

دوران ملازمت تربیتی پروگراموں کا نہ انھیں کوئی خاص فائدہ ہوتا ہے نہ ہی ان کے اسکولوں اور ان سے پڑھنے والے بچوں پر ان کا کوئی خاص اثر مرتب ہوتا ہے اور اس طرح اردو میڈیم اساتذہ اور ان کے اسکولوں کی حالت تقریباً جوں کی توں رہتی ہے۔ اسی طرح اردو میڈیم اسکولوں میں غیر اردو داں اساتذہ کا تقرر بھی ایک دیرینہ مسئلہ ہے۔ بہار کے کئی اضلاع میں تحقیقی دورے کے دوران مندرجۂ بالا حقائق کی جانب بارہا توجہ دلائی گئی۔ یہ تمام مثالیں متعلقہ افسران اردو میڈیم اسکولوں کی تئیں جانبدارانہ رویے کی کھلی گواہی دیتی ہیں۔

پنڈت نہرو نے اپنے 26 مارچ 1958 کے وزرائے اعلیٰ کے نام لکھے گئے خط میں زبان کے مسئلے سے متعلق صاف طور پر لکھا تھا کہ ''ہم نے صورت حال سے نپٹنے کے لیے ضابطے اور قوانین تو مرتب کر دیے ہیں لیکن سوال یہ ہے کہ ہم ان قوانین اور ضابطوں پر کہاں تک عمل کر پا رہے ہیں؟ انھوں نے مزید لکھا کہ ''سب کچھ نچلے افسران کی بڑی تعداد پر منحصر ہے جو اکثر و بیشتر غیر جانبدارانہ اور منصفانہ ذہن سے کوسوں دور ہوتے ہیں۔ شاید اردو اور اردو میڈیم اسکول آج بھی اس افسرانہ ذہنیت کے مضر اثرات کا شکار بنے ہوئے ہیں۔ اگر اردو کی تعلیم اس طرح کے حالات سے مستقل دوچار رہتی ہے تو عجب نہیں کہ اردو بولنے والا طبقہ دھیرے دھیرے ایک ایسی زبان کی تبدیلی (Language Shift) کا شکار ہو جائے جس کی طرف ایک مشہور امریکی ماہر لسانیات جوشوا فشمین (Joshna Fishman) نے اشارہ کیا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ زبان کے تئیں منفی رویے کی بنا پر بہت سے سماجوں میں تبدیلیِ زبان کا مسئلہ سامنے آرہا ہے جس کے تحت ایک مخصوص زبان بولنے والے مجبوراً اپنی زبان کو خیرباد کہہ کر دوسری زبان کو اختیار کر لیتے ہیں۔ ایسا لگتا ہے کہ ہندوستان میں اردو کے معاملے میں صورت حال اتر پردیش میں پیدا ہونی شروع ہو گئی ہے۔ فش مین کے مطابق تبدیلی زبان کے اس عمل کو زبان بولنے والوں ہی کی مدد سے روکا جاسکتا ہے۔ ان کے مطابق کناڈا، اسپین اور اسرائیل میں زبانوں کی تبدیلی کے اس عمل کو بیدار ذہن لوگوں ہی نے قابو میں کیا تھا۔ اردو والوں کو ان تجربات سے فائدہ اٹھانا چاہیے۔

ضرورت اس بات کی ہے کہ اردو سے ہمدردی رکھنے والے افراد ضلعی، صوبائی اور قومی سطح پر ایسی منظم جماعتیں تشکیل دیں جو حکومت، افسران اور اسکولوں کے درمیان ایک فعال ربط (Link) پیدا کریں اور نگرانی کا فریضہ انجام دیں۔ اردو میڈیم اداروں کے مسائل کے حل کے لیے ذمے داران کی توجہ، تعاون اور عملی اشتراک حاصل کریں۔

دوسری جانب حکومت کی طرف سے اردو میڈیم کتابوں کی تیاری، اشاعت اور تقسیم کے لیے باقاعدہ قومی اردو ٹیکسٹ بک ڈیولپمنٹ کارپوریشن قائم کی جائے جس کے اپنے ریجنل مراکز ہوں اور یہ کارپوریشن ضرورت کے مطابق مختلف علاقوں میں اردو میڈیم نصابی کتابیں مہیا کروائے۔ اسی طرح اردو میڈیم اساتذہ کی ابتدائی تربیت کے نئے ادارے کھولے جائیں جو ہر صوبے میں اردو میڈیم اساتذہ کی ضرورت کو مدِنظر رکھ کر قائم ہوں۔ جس صوبے یا ضلع میں اردو میڈیم اسکول ہوں وہاں بورڈ کے امتحانات کے پرچے اردو میڈیم میں بھی مہیا کروائے جائیں۔ بہار میں بورڈ کے امتحانات کے پرچے اردو میڈیم میں مہیا نہ کروانے کے سبب بعض طلبہ نے اپنا میڈیم ہندی کر دینا بہتر سمجھا۔ مرکزی حکومت کی جانب سے اردو میڈیم اساتذہ کی پیشہ ورانہ ترقی کے لیے قائم کردہ تین اکادمیوں کو اردو میڈیم اسکولوں اور اساتذہ کے لیے زیادہ مفید تعلیمی و تربیتی مرکز بنانے پر توجہ دی جائے اور ان کی کارکردگی پر ماہرین کی ایک کمیٹی کے ذریعے وقفے وقفے سے نظرثانی کی جائے۔ اردو میڈیم اسکولوں کے اساتذہ کا ایک کاڈر ترتیب دیا جائے اور اردو میڈیم اسکولوں میں اس کاڈر سے اساتذہ کی تقرری اور منتقلی کی جائے۔

□□□

پتہ:
Deen Faculty of Education,
Jamia Millia Islamia, New Delhi

ہمارا نیا ای میل، آئی ڈی

Email:urduduniyancpul@yahoo.co.in

قومی اردو کونسل اور ماہ نامہ ''اردو دنیا'' اور سہ ماہی ''فکر و تحقیق'' سے خط و کتابت
بذریعہ ای میل اب اس پتے پر کریں۔

مناظر عاشق ہرگانوی

تعلیم کا گرتا معیار اور اس کے اسباب

آج اکیسویں صدی میں مادی ترقی میں ہم بہت آگے بڑھ چکے ہیں لیکن معیار تعلیم اتنی ہی تیزی سے زوال پذیر ہورہا ہے۔ ایسا کیوں ہے؟

ہم جانتے ہیں کہ جدید رویوں، اقدار اور نظریات کی توسیع میں تعلیم ایک مؤثر رول ادا کرتی ہے۔ تعلیم کے ذریعے ہی فرد یا افراد باہر کی دنیا سے روشناس ہوتے ہیں اور اپنی شخصیت میں وہ صلاحیت پیدا کرتے ہیں جس سے امتیازی نشان بنتا ہے۔ اس کے باوجود ہر فرد یا جماعت سے یہ توقع کرنا غلط ہوگا کہ وہ جدید کاری کے بارے میں تعلیم کے رول سے واقف ہے۔ ایسا کرنے کا مطلب یہ ہوگا کہ ہم نے تعلیم کی افادیت اور اس کی قدر و قیمت کے بارے میں صحیح نقطۂ نظر اختیار نہیں کیا ہے۔ اس لیے کہ ہر جگہ تعلیم کا فائدہ صحیح معنوں میں اعلیٰ طبقے نے ہی اٹھایا ہے اور یہی طبقہ سب سے زیادہ یہ بات محسوس کرسکتا ہے کہ جدید رویوں کی تشکیل یا سماجی تبدیلی کے لیے مناسب حالات پیدا کرنے میں تعلیم کیا رول ادا کرسکتی ہے۔ سماج کی بڑی اکثریت جو تعلیم کے سودمند اثرات سے واقف نہیں ہے وہ اس بات کی پروا نہیں کرتی کہ تعلیم سے اس کی زندگی کو کیا فائدہ پہنچ سکتا ہے۔ ایک لیموں بیچنے والے یا جوتے پالش کرنے والے لڑکے سے میں نے پوچھا کہ پڑھتے کیوں نہیں؟ اسکول کیوں نہیں جاتے؟ تو اس کا سیدھا سا جواب تھا کہ پڑھ کر کیا کروں گا، بے پڑھے بھی پیسے کمارہا ہوں۔

تعلیم کی طرف سماج کی اکثریت کے رویے یا تعلیم حاصل کرنے یا نہ کرنے کے بارے میں اس کے فیصلے کا دارومدار اس پر ہے کہ جن ملحوظات کی بنیاد پر یہ فیصلہ ہو وہ قطعی اور واضح ہوں۔

تعلیم کو ایک کارکردگی کے طور پر اختیار کرنے کے لیے وقت، صلاحیت اور وسائل کی ضرورت ہے، اگر تعلیم کو مکمل طور پر مفت کردیا جاتا ہے تو بھی اس کے حصول کے لیے وقت اور صلاحیت درکار ہوگی۔ اس طرح تعلیم حاصل کرنے میں جو وقت صرف ہوگا اس کے نتیجے میں ان وسائل کا نقصان ہوگا جو اسی وقت میں، تعلیم حاصل کرنے کے بجائے دوسری کارکردگی کے ذریعے حاصل کیے جاسکتے ہیں۔ والدین اگر یہ دیکھتے ہیں کہ تعلیم ان کے بچوں کے مستقبل کے خواب پورے کرسکتی ہے تو وہ نہ صرف یہ کہ بچوں کو تعلیم دلانے پر بہ خوشی آمادہ ہوجاتے ہیں بلکہ اس کے لیے ہر ممکن قربانی کے لیے بھی تیار رہتے ہیں۔

تعلیم وہ پیمانہ ہے جس سے کسی ملک، قوم اور معاشرے کی ترقی کی نشاندہی ہوتی ہے۔ تعلیم نہ صرف انسانی زندگی اور سماج کو شائستہ اور مہذب بناتی ہے بلکہ اس کے شعور اور اقدار کی سمتوں کا تعین بھی کرتی ہے اور اسے قوت و توانائی عطا کرتی ہے۔ تعلیم کسی قوم کی شخصی، اقتصادی، سماجی، سیاسی اور ثقافتی نشوونما کی ضامن ہوتی ہے، اسی کی بدولت آج دنیا کے مختلف ممالک اور بہت سی قومیں ترقی اور خوشحالی کی بلندی پر ہیں اور ان کی مسلسل ترقی کا سفر جاری ہے۔

ہمارا ملک ابھی ترقی پذیر ہے، اس لیے یہاں کے تعلیمی نظام کی تشکیل اور اس کے نفاذ کی ذمے داریاں سنجیدہ اور غیر معمولی توجہ کی متقاضی ہیں۔ یہ ذمے داریاں اس وقت اور بڑھ جاتی ہیں جب ہم اپنے آزاد ملک کی ساٹھ سالہ تعلیمی کارکردگیوں پر نظرثانی کرتے ہوئے اسے ایک نئی سمت عطا کرکے اکیسویں صدی تک لے آئے ہیں۔ لیکن آج کی حقیقی صورت حال کیا ہے، ہم یہ جانتے ہیں کہ نظام تعلیم جتنا معیاری اور اعلیٰ درجے کا ہوگا اتنے ہی اعلیٰ افکار کے افراد تیار ہوں گے۔ مگر تعلیم کا معیار روز بروز گرتا جارہا ہے۔ اس گرتے ہوئے معیار کی ذمے داری کسی فرد واحد پر نہیں ہے۔ کہیں یہ الزام طالب علم پر لگایا جاتا ہے، کہیں اساتذہ پر، کہیں سیاستدانوں پر اور کہیں والدین پر۔

پست معیار تعلیم کا ایک سبب، موجودہ نظام تعلیم ہے جو لاحاصل کے سوا طالب علم کو کچھ نہیں دے رہا ہے۔ تعلیمی اداروں میں ایسا ماحول ہی پیدا نہیں کیا جاتا جس سے طالب علم کے اندر عمل اور تحقیق کا مادہ پیدا ہو۔ خاص کر بی.اے. اور ایم.اے. کی سطح پر۔

سیاستدانوں کو بھی ذمے دار مانا جاسکتا ہے۔ کیونکہ وہ حکومت میں رہ کر نظام تعلیم کو بدلنے اور اسے سائنٹفک بنیادوں پر استوار کرنے کی سنجیدہ کوشش نہیں کرتے۔ اگر حکومت کے باہر ہوتے ہیں تو طلبہ کو اپنا آلۂ کار بناتے ہیں اور ان کے ہاتھوں سے قلم چھین کر ہتھیار تھما دیتے ہیں، بینر تھما دیتے ہیں، جس کے نتیجے میں پورا معاشرہ آج بے چینی اور افراتفری کی زد میں ہے — با مقصد تعلیم کو نافذ کرنے پر کوئی توجہ نہیں کہ موجودہ تعلیمی انحطاط ختم ہو۔

آج کے اساتذہ بھی تعلیم کے گرتے معیار کے ذمے دار ہیں۔ کیونکہ بچہ جب اسکول میں داخل ہوتا ہے تو اس کی عمر زیادہ سے زیادہ چار سال ہوتی ہے۔ اس عمر میں بچہ ایک کھلونا گاڑی کی طرح ہوتا ہے جسے جدھر چاہیں موڑ کر چلایا جاسکتا ہے۔ اس وقت ایک استاد ہی ہوتا ہے جو بچے کی صحیح تربیت کرسکتا ہے۔ تربیت کا یہ سلسلہ بچے کی اعلیٰ تعلیم تک جاری رہتا ہے۔ موجودہ نظام تعلیم

اساتذہ کا ہی لگایا ہوا پودا ہے۔

ایک اور وجہ مربوط نظامِ تعلیم وضع کرنا ہے۔ طبقاتی نظامِ تعلیم کو ختم کرنے کی کوشش کی طرف ذرا بھی دھیان نہیں ہے۔ امیر طبقے کی اولاد اعلیٰ درجے کے تعلیمی اداروں میں تعلیم حاصل کرتی ہے جن کی فیس اتنی زیادہ ہوتی ہے کہ ایک غریب طالب علم ادا نہیں کرسکتا۔ وہ ایسے تعلیمی اداروں میں پڑھنے جاتے ہیں جہاں بیٹھنے میں بھی تکلیف ہوتی ہے اور جہاں ایسے استاد ملتے ہیں جو ان کی صلاحیتوں کو سمجھ کر انھیں تربیت نہیں دے سکتے۔

تعلیم کے گرتے معیار کی ایک وجہ ٹیوشن کی وبا بھی ہے جس میں معیار تعلیم پر کم، اور روپے پر زیادہ توجہ دی جاتی ہے۔ مشکل اور دقیق نصاب کی وجہ سے طالب علم ٹیوشن پڑھنے پر مجبور ہوتے ہیں۔

تعلیم کی اصل بنیاد پرائمری سطح پر ہے۔ یہ جس قدر مضبوط ہوگی تعلیم کا معیار اتنا ہی بلند ہوگا لیکن سچ تو یہ ہے کہ منظور شدہ نصاب بچوں کی استعداد سے باہر اور ان کی ذہنی رسائی سے بالاتر ہوتا ہے۔ انگلش میڈیم اسکولوں کا معیار بچوں کی ذہنی سطح سے اور بھی زیادہ اونچا ہوتا ہے۔

اونچے درجوں پر نظر ڈالتے ہیں تو اور بھی مایوسی ہوتی ہے۔ بی.اے. آنرز اور ایم.اے. کی سطح پر اردو کے سولہ سولہ پیپرز میں صرف ادب پڑھایا جاتا ہے۔ دو پیپر کمپیوٹر کے رکھ دیے جائیں، صحافت شامل کر لی جائے، ترجمے کا بھی پیپر ہو تو اردو میں آنرز اور ایم.اے. کرنے کے بعد طالب علم کو شاید بیکار نہ بیٹھنا پڑے۔ آج تمام شعبہ ہائے زندگی میں پائی جانے والی خرابیوں کی اصل جڑ تعلیم اور تربیت میں کمی ہے۔ تربیت سائنٹفک ہو اور تعلیم کا معیار ہر طبقے کے لیے ایک ہو، نصاب پر بھی خصوصی توجہ کی ضرورت ہے۔

□□□

پتہ:

Kohsar, Bhikanpur-3,
Bhagalpur-812001
(Bihar)

فانی بدایونی (جدید ایڈیشن)

مصنف: مغنی تبسم

اردو غزل کے احیائے جدید میں فانی کا نام بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ پروفیسر مغنی تبسم نے اس کتاب میں فانی کی حیات، شخصیت اور شاعری کا تحقیقی و تنقیدی مطالعہ پیش کیا ہے۔ موصوف نے فانی کے ناقدین و محققین، عزیز و اقارب، احباب اور جاننے والوں سے شخصی ربط پیدا کرکے ان سے متعلق اہم معلومات یکجا کر دی ہے اور شاعر کے فن کے تجزیے کے لیے لسانیات کی اہم شاخ ''اسلوبیات'' کے ذریعے کلامِ فانی کے صوتی آہنگ کا دلچسپ مطالعہ کیا ہے جو اردو شعر و ادب میں اپنی نوعیت کی پہلی باضابطہ کوشش ہے۔

صفحات: 499، قیمت: -/210 روپے

نشاطِ روح

شاعر: اصغر گونڈوی

اصغر گونڈوی کے مجموعۂ کلام ''نشاطِ روح'' (مرتب: مرزا احسان احمد) کی پہلی اشاعت 1925 میں مطبع معارف اعظم گڑھ سے اور دوسری اشاعت (مرتب: اقبال احمد سہیل) 1982 میں اتر پردیش اردو اکادمی لکھنؤ سے عمل میں آئی تھی۔ اقبال احمد سہیل نے اس مجموعے کو بڑی دیدہ ریزی سے مرتب کیا ہے۔ مرزا احسان احمد کے دیباچے اور مقدمے کے بعد انھوں نے ''تبصرہ'' کے عنوان سے اصغر گونڈوی کی شاعری کا مبسوط محاکمہ کیا ہے اور ان کی شاعری کے محاسن کو موسیقی، بت تراشی، ایجاد و تخلیق، مصوری اور اسرار و معارف کے الگ الگ عنوانات سے سمجھنے کی کوشش کے بعد آخر میں اصغر گونڈوی کا کلام شامل کیا ہے۔ اصغر گونڈوی کی غزلوں کی ہمہ گیری اور اثر انگیزی کے مطالعے کے لیے اس نسخے کا مطالعہ ناگزیر ہے۔ اسی اہمیت کے پیشِ نظر قومی اردو کونسل نے اس کا تازہ ایڈیشن شائع کیا ہے۔

صفحات: 73، قیمت: -/49 روپے

محمد علی جوہر

تعلیم اور اخلاقی قدریں

علم سیکھنا اور سکھانا ایک مقدس فریضہ سمجھا جاتا رہا ہے۔ زمانہ قدیم میں تو اسے اتنا تقدس حاصل تھا کہ طلبہ اپنے گھربار سے دور لمبی مسافتیں طے کر کے اہل علم کے پاس علم حاصل کرنے پہنچتے تھے اور استاد کے قدموں پر اپنا پورا وجود رکھ دیتے تھے۔ خود استاد کا یہ حال تھا کہ سارے سماج سے الگ اس کی ایک اپنی دنیا ہوتی تھی۔ استاد کے ہر حکم کو بجا لانا شاگرد اپنے لیے باعث فخر سمجھتا تھا اور استاد شاگرد کی تعلیم و تربیت کو اپنا مقصدِ زندگی تصور کرتے تھے۔ ہندوستان میں گرو اور چیلے کا رشتہ ایک مقدس رشتہ تصور کیا جاتا تھا۔ شاگرد کی تعلیم کا ایک حصہ تھا گرو کی خدمت کرنا۔ گرو عام سماجی زندگی کے شور اور ہنگامے سے دور فطرت کے پرسکون ماحول میں کہیں جنگل میں یا کسی دریا کے کنارے ایک چھوٹی سی کٹیا میں اپنے علم کی کائنات سجا کر بیٹھ جایا کرتے تھے اور طالب علموں کے علم کی تشنگی بجھانے کے لیے ہم وقت تیار رہتے تھے۔ استاد شاگرد اور فطرت تینوں کا گہرا رشتہ تھا۔ فطرت کے آنگن میں بیٹھ کر انسان اور فطرت کے رشتے کو سمجھنے کی کوشش کا یہ سلسلہ استاد اور شاگرد دونوں کو آسودگی کے احساس سے شرابور کر دیا کرتا تھا۔ اس وقت کی قدروں میں یہ بات شامل تھی کہ جب طالب علم کچھ سیکھنے نکلے گا تو وہ اپنے پیچھے اپنی ساری حیثیت گھر پر ہی چھوڑ جائے گا۔ غریب کے لیے بھی وہی چٹائی، شہزادے کے لیے بھی وہی چٹائی اور استاد کے لیے بھی وہی چٹائی ہوتی تھی۔ جس کے پاس علم کی دولت ہو اسے پھر اور کون سی دولت چاہیے۔ یہ وہ تصور تھا جو استاد کو مادی ضرورتوں سے اوپر اٹھا کر علم کی اس مسند پر بیٹھا دیا کرتا تھا جس کے روبرو پہنچ کر حاکم وقت کی گردن بھی جھک جایا کرتی تھی۔ عباسی عہد کا مشہور واقعہ ہے کہ خلیفہ کا بیٹا ایک عالم دین کے پاس علم حاصل کرنے پہنچا۔ ایک دن خلیفہ کا گزر ادھر سے ہوا اس نے دیکھا کہ وہ عالم دین وضو کر رہے تھے اور اس کا بیٹا ان کے ہاتھ پیر پر پانی ڈال رہا تھا۔ یہ دیکھ کر خلیفہ سواری سے اتر کر قریب پہنچا اور اس نے اپنے بیٹے کو ڈانٹتے ہوئے کہا تمھیں اتنا بھی نہیں پتہ کہ استاد کی خدمت کس طرح کی جاتی ہے۔ ایک ہاتھ سے پانی ڈالو اور دوسرے ہاتھ سے ان کے پاؤں ملو اور ہاتھ دھلاؤ۔

استاد کا یہ احترام زمانہ قدیم سے چلا آرہا ہے۔ آج بھی استاد اور شاگرد کا رشتہ ایک مقدس رشتہ تصور کیا جاتا ہے لیکن یہ بھی صحیح ہے کہ وقت بدلنے کے ساتھ ساتھ اس رشتے میں کمزوری پیدا ہوئی ہے اور یہ رشتہ بھی ایک حد تک کاروباری بن کر رہ گیا ہے۔ اب دوسرے کاروباروں کی طرح تعلیم و تعلیم نما کام بھی کچھ دینے اور بدلے میں کچھ پانے کی چیز بن گیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ نہ تو طلبہ اساتذہ کا ویسا احترام کرتے ہیں جیسا کہ ماضی میں ہوتا رہا ہے اور نہ ہی اساتذہ طلبہ کو اس نظر سے دیکھتے ہیں جس نظر سے استاد اپنے شاگردوں کو دیکھا کرتے تھے۔

جب سے علم کو مادی منفعت کے حصول کا ذریعہ سمجھا جانے لگا اور روزی روٹی سے براہِ راست تحصیلِ علم کا رشتہ جوڑ دیا گیا تو تعلیم و تدریس کی اخلاقی قدروں پر مادیت کا غلبہ ہونے لگا۔ رفتہ رفتہ لوگوں نے علم کو خریدنا اور بیچنا شروع کر دیا۔ پہلے علم کو خدا کی امانت سمجھ کر بندوں تک پہنچایا جاتا تھا۔ اب صورتِ حال یکسر بدل گئی ہے۔ اس تبدیلی کو علامہ اقبال نے بہت پہلے محسوس کر لیا تھا جب انھوں نے کہا تھا:

تھے وہ بھی دن کہ خدمت استاد کے عوض
جی چاہتا تھا ہدیۂ دل پیش کیجیے
بدلا زمانہ ایسا کہ لڑکا پس از سبق
کہتا ہے ماسٹر سے کہ بل پیش کیجیے

ہم یہ دیکھ رہے ہیں کہ ملک کے گوشے گوشے میں پرائیویٹ پبلک اسکول کا جال سا بچھا جارہا ہے اور یہ تعلیمی ادارے روپے کمانے کی صنعتیں بنتے جارہے ہیں۔ جو طلبہ اس قسم کے اداروں سے فارغ التحصیل ہو کر نکلتے ہیں وہ ایثار و قربانی ہمدردی و صلہ رحمی کے جذبات سے یکسر عاری ہوتے ہیں۔ لہٰذا وہ افسر بنیں یا معلم ان کی نگاہ ہمیشہ روپے کمانے پر لگی رہتی ہے اور یہیں سے بگاڑ کا سلسلہ شروع ہوتا ہے۔ ہر معلم پچیس سے تیس سال تک اوسطاً معلمی کے فرائض انجام دیتا ہے اور مسلسل کئی دہائیوں تک اسی قسم کی ذہنیتیں پیدا کرتا چلا جاتا ہے جیسی خود اس کی ذہنیت ہوتی ہے۔

آج ملک جس سیاسی اور سماجی بحران سے گزر رہا ہے وہ ملک کے بہی خواہوں کے لیے ایک لمحۂ فکریہ بن چکا ہے۔ وہ نسلیں سپردِ خاک ہو گئیں جن کی تعلیم و تربیت کسی نہ کسی معلمِ اخلاق کے ہاتھوں ہوئی تھی۔ ان کی جگہ جو نسل لے رہی ہے وہ بدلے ہوئے ماحول میں پروان چڑھی ہے۔ جہاں آدمی اخلاقی قدروں کے بجائے مادی مفادات کا تابع ہو کر رہ گیا ہے۔ جو لوگ اخلاقی قدروں سے نابلد ہوں انھیں دولت و اقتدار کے لیے ناروا سمجھوتہ کرنے اور ناجائز طریق کار اپنانے میں کیا جھجک محسوس ہوگی۔ یہی وجہ ہے کہ رفتہ رفتہ

لوٹ کھسوٹ کا بازار گرم ہوتا چلا گیا۔ اب یہ عالم ہے کہ ملک اقتصادی ناہمواری کے ایک ایسے موڑ پر کھڑا ہے کہ اگر جلد ہی کوئی موثر مدافعتی قدم نہ اٹھایا گیا تو بہت خراب نتائج سامنے آسکتے ہیں۔

آج ملک کو ایک نئے انقلاب کی ضرورت ہے اور یہ انقلاب سب سے پہلے تعلیم کے میدان میں آنا چاہیے۔ ملک کے دانشوروں کو یہ طے کرنا ہے کہ ہماری تعلیم کے بنیادی مقاصد کیا ہوں گے۔ وہ کون طریقۂ کار اختیار کیا جائے کہ ہماری جو روایتی تعلیمی قدریں تھیں وہ پامال نہ ہوں اور ہم موجودہ عہد کے تقاضوں کو بھی پورا کرسکیں۔ ہمارے اساتذہ یہ سوچ کر پڑھائیں کہ تدریس ان کا پیشہ ہی نہیں اخلاقی فریضہ بھی ہے اور وہ ایک نئی صحت مند قوم کی بنیاد رکھنے جارہے ہیں۔

دوسرے رشتوں کی طرح استاد اور شاگرد کا رشتہ ابھی اتنا کمزور نہیں ہوا ہے کہ اس کا ماتم کیا جائے۔ ابھی ایسے استاد موجود ہیں جو علم کی ترویج و اشاعت کو اپنی خوش نصیبی تصور کرتے ہیں۔ ایسے طلبہ بھی موجود ہیں جن میں حصول علم کی لگن ہے اور جو استادوں کا احترام کرنا چاہتے ہیں۔ آنے والے کل کی امیدیں انھی سے وابستہ کی جاسکتی ہیں۔

□□□

Deptt. of Urdu,
Aligarh Muslim University,
Aligarh

شعر، غیر شعر اور نثر

مصنف: شمس الرحمٰن فاروقی

جناب شمس الرحمٰن فاروقی کے خیال انگیز مضامین کا یہ مجموعہ پہلی بار 1973 اور دوسری بار 1998 میں شائع ہوا تھا۔ اس میں شامل مضامین نے تفہیم شعر و ادب کی نئی راہیں کھولیں۔ یہ اس اہم کتاب کا تازہ ترین ایڈیشن ہے جس میں ''پس نوشت: آج یہ کتاب'' کے عنوان سے ایک نئے مضمون کا اضافہ بھی کردیا گیا ہے۔ جدید ادب اور جدیدیت کی تفہیم نیز کلاسیکی ادب کی فہم و بازیافت دونوں کے لیے اس کتاب کا مطالعہ ضروری ہے۔

ڈیمائی سائز، صفحات: 528، قیمت: -/228 روپے

دیوان درد

مرتب: ڈاکٹر نسیم احمد

خواجہ میر درد اردو کے صرف صوفی شاعر ہی نہیں بلکہ ان کی غزلیہ شاعری غزل کی اس توانا روایت کا حصہ ہے جس کی نمائندگی اعلیٰ سطح پر میر تقی میر کررہے تھے لیکن افسوس کہ درد کی وفات کے بہت بعد ان کے کلام کی اشاعت ہو پائی اور وہ بھی اختلافات متن کے ساتھ۔ ہندو پاک میں ''انتخاب کلام درد'' اور ''دیوان درد'' کے انھی متعدد مطبوعہ و غیر مطبوعہ نسخوں کے پیش نظر ڈاکٹر نسیم احمد نے ''دیوان درد'' کا یہ نسخہ ترتیب دیا ہے اور اس کی تفصیلی وضاحت مقدمے میں کردی ہے۔

صفحات: 336، قیمت: -/160 روپے

نوٹ: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دھلی کی جانب سے طلبہ اور اساتذہ کے لیے بالترتیب 45% اور 40% کی خصوصی رعایت دی جاتی ھے۔ تاجران کتب کو قومی اردو کونسل کے ضوابط کے مطابق رعایت دستیاب ھے۔ ادارہ

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، شعبۂ فروخت: ویسٹ بلاک-8، ونگ-7، آر. کے. پورم، نئی دہلی-110066

ذکیہ مشہدی

بڈّا نہیں مری

املی کے پتّا۔ نوانو اپتّا۔ کھڑا رہو بیٹا۔ دلے چھو۔ دلے چھو۔ دلے چھو۔

کمبخت درجنوں کے حساب سے تھے اور ایسا شور مچا رہے تھے جیسے میدان حشر میں کھڑے ہوں۔ مخالف ٹیم کا ایک کھلاڑی مار لیا گیا تو اور غل مچا۔ ہو ہو ہو۔ نومبر کی خنک ہوا۔ ان ساری آوازوں کو سمیٹے گھر میں داخل ہوئی۔ توے پر اماں کی باریک چپاتی پھول کر غبارہ ہو اٹھی۔ وہ اسے چمٹے سے اتارتی ہوئی بڑبڑائیں۔ شیر کی چربی کھا رکھی ہے کم بختوں نے۔ سردی بھی نہیں لگتی کہ گھر جائیں۔ رات ہوگئی اور سڑک پر کبڈی کھیل رہے ہیں۔ نہ اماں کو فکر نہ ابا کو۔

صفیہ ہی ہی کر کے ہنس پڑی۔ سب کی فکر میں اماں ہی دیوانی رہا کرتی ہیں۔ اپنے بچوں کو تو دربے میں مرغیوں کی طرح بند کر رکھا ہے۔ دوسرے بھی ان کا فلسفہ مانیں۔

کیا ٹھی ٹھی لگا رکھی ہے۔ وہ باقاعدہ ناراض ہوگئیں۔ ساگ پڑا ہے توڑنے کو۔ آج پھر کھانا پکنے میں دیر ہوگئی۔ صفیہ نے ساگ کی ڈلیہ نزدیک سرکائی۔ چولھے کی آنچ خوشگوار معلوم ہو رہی تھی۔

اچانک جیسے بھونچال آگیا۔ سیڑھیوں پر بھد بھد کرتی بڈّا دور ہی سے چلاتی چلی آ رہی تھی۔ ارے سکھو، سکھو رانی ہو۔

صفیہ کو اس سکھو سے پتنگے لگتے تھے۔ کتنی بار اس نے بڈّا کا تلفظ صحیح کرنے کی کوشش کی تھی۔ مگر کمبخت کے منہ سے کبھی 'ف' صحیح ادا نہ ہوا۔ ویسے تو اس کا بھی صحیح نام وِدّیا تھا، لیکن خود اس کے گھر والے بڈّا کہتے تھے اور اس کا صحیح نام لینے والے تو کیا جاننے والے بھی محلے میں دو چار ہی تھے۔ جن میں وہ پنڈت جی بھی شامل تھے جنھوں نے اس کا نام کرن کیا تھا، باقی سب کے لیے وہ بڈّا تھی۔ سکھو سکھو کرتی اور صفیہ کا خون جلاتی بڈّا اب اوپر چڑھ آئی تھی۔ گول مول، موٹی، گوری، بھر ہاتھ چوڑیاں اور مانگ میں چوڑا سیندور۔ وہ محض چودہ سال کی تھی۔ صفیہ سے سال ڈیڑھ سال بڑی۔ بیاہ ہوئے سال بھر ہو چکا تھا۔ اب کی لگن میں گونا بھی ہو جائے گا۔

"ارے اب کی گھروندا نہ سجے گا......؟" پھولتی سانسوں اور پائل کی چھما چھم کے درمیان وہ کہہ رہی تھی۔ کل دھن تیرس، پرسوں دیوالی بس کل ہی سجاتے ہیں۔ صفیہ نے لہجے کے جوش اور مسرت کو دباتے ہوئے کنکھیوں سے اماں کی طرف دیکھا اور ہڑبڑاہٹ میں چنے ہوئے ساگ کے ساتھ کچھ ڈنٹھل بھی ملا دیے۔ بڈّا کو اپنے بڑے اور بیاہے ہوئے ہونے کا شدید احساس تھا، صفیہ کے ہر کام میں ادبدا کر نقص نکالتی۔ اس وقت بھی وہ پسر کر بیٹھ گئی اور صفیہ کے چنے ہوئے ساگ میں ملے اکا دکا ڈنٹھل الگ کرنے لگی۔

"ارے سب گل جائیں گے۔ ایک دو رہ بھی گئے تو کیا ہوا" صفیہ نے منہ لٹکا کر کہا۔ "گُرا تو جائے بکری کے ہاتھ گوڑ ہو ن تو کھات ہو۔ مُلا ساگ توڑے کا تریکہ بائے" (گل تو جائیں گے بکری کے ہاتھ پیر بھی جو تم کھاتی ہو، مگر ساگ توڑنے کا طریقہ بھی کوئی چیز ہے) بڈّا اکثر صفیہ کو "بکری کے ہاتھ پیر" کھانے کے لیے چڑاتی تھی۔ اسے معلوم تھا صفیہ کو پائے کا سالن بہت پسند ہے۔

اماں ہنسنے لگیں یہ صفیہ تو بلا کی پھوہڑ ہے۔ آلو چھیلنے بیٹھتی ہے تو موٹے موٹے چھلکے اتار کر آدھے آلو پھینک دیتی ہے۔ ذرا اسے کچھ سکھاؤ بدا۔ تم سگھڑ بیٹی ہو۔

بدا نے شرارت سے کاجل بھری آنکھیں مٹکائیں۔ منٹوں میں جھپا جھپ ڈلیا بھر ساگ توڑ کر اماں کے آگے سرکا دیا۔ پھر اٹھ کھڑی ہوئی۔ "جیتی رہو" اماں نے دعا دی۔ یہ صفیہ تو ابھی گھنٹوں اتنے سے ساگ میں الجھی رہتی۔ صفیہ نے دانت کچکچائے اور دل میں سوچا کہ وہ بدا کا گھروندا رنگنے ہرگز نہیں جائے گی۔ لیکن دوسرے دن دروازے پر سکھو کی پکار پڑتے ہی تیر کی طرح اٹھ کر بھاگی۔

چونے سے لپا پتا دو منزلہ گھروندا بدا کے بڑے سے لب سڑک چبوترے پر سر اٹھائے کھڑا تھا۔ بڑے اہتمام سے صفیہ نے مختلف کٹوریوں میں رنگ کی پڑیا گھولیں۔ بدا مٹی کے کھلونوں میں سے ایک تھالی نکال کر بھر تھالی پیڑے لے آئی۔ صفیہ کو پیڑے بہت پسند تھے۔ مگر اسے گھروندا رنگنے کے لیے کسی رشوت کی ضرورت نہیں تھی۔ ڈرائنگ کا خداداد شوق تھا اور صلاحیت بھی۔ منٹوں میں دیوی دیوتاؤں کی تصویریں، کمل کا پھول، بیچ پر نکلتا سورج، پیڑ پودے چڑیاں سب کے سب بدا کے گھروندے پر منہ سے بول اٹھے اور ہر سال کی طرح اس سال بھی اس کا گھروندا محلے کا سب سے شان دار گھروندا ہوگیا۔ جیے میری سکھو۔ اس نے صفیہ کو لپٹا لیا اور آنکھ مار کر بولی۔ "دیوالی ہو جائے تب چٹھی لکھوانے آئیں گے۔"

"سکھو" کے بعد صفیہ کو اس کے اس طرح آنکھ مارنے سے پتنگے لگتے تھے۔ چڑھ کر بولی۔ کالو سے کیوں نہیں لکھواتیں۔ اب تو وہ ساتویں میں آگیا ہے مزے سے لکھ سکتا ہے۔

اری بے سرم، بھائی سے دلہا کو چٹھی لکھوائی جاتی ہے کیا؟

یہ چٹھی والا معاملہ بڑا ہی گڑبڑ تھا۔ بدا کو پانچویں جماعت کے بعد اسکول سے اٹھا لیا گیا تھا۔ گھر بیٹھی تو جو پڑھا تھا وہ بھی بھول گئی۔ لڑکا میٹرک پاس تھا اور شوقین و رومانی مزاج۔ بیوی کو بڑے رنگیلے خط لکھتا اور ایسے ہی جوابوں کی امید کرتا۔ بدا کے خطوط میں دسیوں تو غلطیاں ہوتیں اور ایک خط لکھنے میں گھنٹوں لگ جاتے، اس لیے وہ پلو کے کھونٹ میں خط باندھے سیدھی صفیہ کے پاس چلی آتی تھی۔ جواب آٹھویں جماعت کی طالبہ تھی اور موتیوں جیسی لکھاوٹ تھی اس کی۔

ہاں یہ بات تو ہے۔ صفیہ نے خود کو بڑا احمق محسوس کیا۔ بھلا کالو سے کیسے خط لکھوایا جا سکتا ہے، چھوٹا بھائی ٹھہرا۔ ہاں اسے چڑایا ضرور جا سکتا ہے۔ کالو۔ بھالو۔ خالو۔

دیوالی کی چھٹیاں ختم ہوتے ہوتے ہی کالو بھالو کے ششماہی امتحان شروع تھے، اس لیے وہ بیٹھا پہاڑے یاد کر رہا تھا اور دل ہی دل میں سارے ماسٹروں کے مرنے کی دعا کر رہا تھا۔ گھروندا رنگتی صفیہ کے فوک آرٹ پر اس نے کوئی نکتہ چینی بھی نہیں کی تھی۔ اس لیے کالو، بھالو، خالو کا بھی اس نے کوئی نوٹس نہیں لینا چاہا۔

اب کی صفیہ نے ذرا تیز اور زود اثر نسخہ آزمایا۔ کلو مللو کے دوئی بکرا۔ کھانست چھینکت جیو نکرا (کلو مٹلو کے دو بکرے۔ کھانس چھینک کے مر گئے) کالو کی سات پشتوں میں بھی کبھی کسی نے بکرے نہیں پالے تھے پھر یہ بے تکی کہبت محلے محلے کے لونڈوں کے منہ سے تو قابل برداشت تھی لیکن صفیہ کے منہ سے نہیں۔ اٹھارہ کا پہاڑہ بھی اٹھارہ چھکے پر آ کر اٹک گیا تھا۔ اس نے وہیں سے بیٹھے بیٹھے موٹی سی کتاب اٹھا کر صفیہ پر پھینکی جو سیدھی اس کے سر پر آ کر گری۔ اسی وقت ساڑی کے آنچل سے چہرہ رگڑتی کا کی برآمد ہوئیں۔

''ارے کل موہے پوتھی پھینکتا ہے۔ پڑھنا کیسے آئے گا'' خالص فیض آبادی اودھی میں وہ چلائیں۔ ''یہ تو نہیں ہوا کہ دیدی کا گھروندا سجاتا۔ بیچو بے چاری سجا رہی ہے تو اسے تنگ کرتا ہے۔'' وہ بڑبڑاتی ہوئی اندر واپس ہو گئیں تو کالو نے صفیہ کی چوٹی اتنی زور سے کھینچی کہ وہ چبوترے سے گرتے گرتے بچی۔ بدا نے کالو کو دو جھاپڑ رسید کیے۔ ہڑکمپ مچ گیا۔

جہاں کالو رہے وہاں کوئی ہڑکمپ نہ مچے بھلا۔ صفیہ کی جان جلتی تھی اس کی صورت دیکھ کر مگر بدا کے گونے کے دن اس پر بڑا ترس آیا تھا۔ بدا پر ہر وقت مرکھنڈے بیل کی طرح سینگ چلانے والا کالو سبک سبک کر رو رہا تھا۔ پہلی بار صفیہ کو احساس ہوا کہ گندمی رنگت اور موٹی موٹی آنکھوں والا عمر میں اس سے دو برس چھوٹا یہ لڑکا کبھی ایسا بھی لگ سکتا ہے کہ اس پر پیار آ سکے۔ اس نے جا کر اس کے سر پر ہاتھ رکھ دیا۔ گھنے بالوں کا ریشم جیسا لمس بہت دن تک ہتھیلی پر یوں ہی رہ گیا تھا۔ تازہ اور نیا اور ایسا ہی ایک لمس زیادہ رہ گیا تھا کالو کی ہتھیلی پر جب کئی برس بعد اس نے صفیہ کی رخصتی پر صفیہ کے سر پر ہاتھ رکھا تھا۔ اس کی آنکھیں نم تھیں۔ اکلوتی بہن بڑی شدت سے یاد آئی تھی جو گھر گرہستی میں ابھی تھی کہ برسوں مائیکے کا رخ نہیں کر پاتی تھی۔ دیوالی کے گھروندے خواب و خیال ہو گئے تھے۔ اب نہ کوئی جھگڑنے کو تھا نہ محبتیں نچھاور کرنے کو۔ وہ باقاعدہ رو پڑا تھا۔

املی کے پتّا۔ نوا نوا پتّا۔ ایئر انڈیا کے جمبو جیٹ کے دلی ہوائی اڈے پر اترتے وقت ایئر ہوسٹس کے شستہ انگریزی میں نہ جانے کہاں سے ان دیہاتی بچوں کی آوازیں آ کر مل گئی تھیں۔ پچیس تیس سال پرانی آوازیں۔ یہ گلی میں اب بھی گونجتی ہوں گی۔ بچے یوں ہی شور مچاتے ہوں گے۔ صبح صبح بوڑھے خوانچے والے کی آواز، جاڑوں کی ٹھنڈی یخ ہوا کو کاٹتی بچوں کو بستر سے اٹھاتی ہوگی۔ تاجا حلوا۔ مارے گھی کے نہیں کھایا جائے گا۔ اور محلے کا کوئی بزرگ ہنس کر کہتا ہوگا۔ چوٹا کہیں کا۔ ڈالڈا میں حلوا بناتا ہے اوپر سے ذرا سا گھی چپڑ دیتا ہے اور کا کی ڈھیٹ کالو کو اٹھاتے ہوئے چلاتی ہوں گی'' جانسوری کے بارے ماں (جاسور کے باڑے میں) اور بدا دیوالی میں گھروندے سجاتی ہوگی۔ صفیہ کے بغیر۔

املی کا پتا۔ نوا نوا پتا۔ دلی سے لے کر گھر کے سفر کے دوران ریل گاڑی کی چھک چھک میں بھی کوئی کبڈی کھیلتا رہا۔ کھڑکی سے باہر بھاگتے مناظر میں صفیہ کو وہ بچے دکھائی دیتے رہے جو برسہا برس سے اس کے اردگرد گھوم رہے تھے۔ ٹرین نے خاک وطن کو چوما تو اس نے جلدی جلدی گردن لمبی کر کے پلیٹ فارم کے پاس لگے گل مہر کے درخت کو دیکھنا چاہا۔ درخت وہیں تھا اور بہت بڑا چھتنار ہو گیا تھا۔ گزرتے ہوئے ماہ و سال اس کے ساتھ بھلائی کرتے گزرے تھے۔ ناک اوپر کرتے ہوئے اس نے ہوا کو سونگھا، ہوا میں دیوالی کی خوشبو تھی۔ شہر کی سڑکوں پر دودھ جیسی کھیلیں اور بتاشے بکھرے پڑے تھے اور مٹی کی سوندھی خوشبو والے دیے۔ ابرک بھرے ہاتھی اور گجریاں۔ ابھی بدا کہیں سے تھال بھر کھیلیں، بتاشے اور مٹھائی لیے برآمد ہوگی اور ایک پڑیا بھر پیڑے الگ سے صفیہ کے ہاتھ میں پکڑائے گی اور پھلجھڑیوں کی روشنی میں دونوں کے چہرے ایک ساتھ گلنار ہو اٹھیں گے۔ اس کا دس سالہ بیٹا جو سال بھر کی عمر کے بعد یہاں پھر نہیں آ سکا تھا۔ اس کے احساسات سے بے خبر حیرت سے سب کچھ یوں دیکھ رہا تھا، جیسے وہ میوزیم کے ایک گوشے میں کھڑا ہو۔ اس کی سمجھ میں اسٹیشن پر لینے آئے ہوئے لوگ بھی نہیں آ رہے تھے جو اس کے ماموں ممانی تھے اور گھر کی سیڑھیاں چڑھتے وقت صفیہ کی آنکھوں سے لگی آنسوؤں کی جھڑی بھی اس کی عقل سے پرے تھی۔ ممی بغیر کسی وجہ کے یوں روئے کیوں جا رہی ہیں۔ ایسی بے وقوف تو وہ کبھی نہیں تھی۔

اتنے زمانے بعد آپا آئیں بھی تو آج کل۔ چھوٹی بھاوج کہہ رہی تھی۔ خدا کا شکر ہے کہ لڑکی کو ساتھ نہیں لائیں۔ اس کا لہجہ صفیہ کو بے چین کر گیا۔ وہ جان بوجھ کر تہوار کے زمانے میں آئی ہے۔ ہولی دیوالی دیکھنے کو آنکھیں ترس گئیں۔ مٹی کے کھلونوں کو وہ خواب میں دیکھتی ہے۔ اور رنگ کی پچکاریوں کو اور دیہاتی طرز سے سجے گھروندے کو جو اتنا خوبصورت ہوا کرتا تھا اور محبت کی مٹھاس بھری اس سہیلی کو جو اس قدر جاہل تھی کہ میاں کو خط نہیں لکھ پاتی تھی۔ وہ آج کل کیوں نہ آتی۔ دیوالی تو ایسا محبت بھرا تہوار ہے روشن اور میٹھا۔ وہ چھجے پر چلی آتی ہے اور چق ہٹا کر باہر دیکھتی ہے۔ وہ سارے بچے سڑک پر بکھرے ہوئے ہیں۔ بالکل حقیقی۔ نور محمد میاں کا بکرا یوں ہی جگالی کر رہا ہے۔ کھپریل کے نیچے طاہر میاں کی مشین رواں دواں ہے اور چھوٹے لال ترکاری کچوری کا ناشتہ کر کے توند پر ہاتھ پھیر تا ڈکار لے رہا ہے اور شام کو دھن تیرس کی خریداری کرنے والوں کے انتظار میں دکانیں سج رہی ہیں۔ اچانک سڑک پر زور کا شور بلند ہوتا ہے۔ زور زور کی آوازیں۔ ساتھ میں گالیاں بھی۔ گلی میں بہت سے لوگ اکٹھا ہونے لگے ہیں۔ چھوٹی بھاوج اندر سے ہڑبڑائی ہوئی آتی ہے۔

''کیا ہو رہا ہے آپا۔۔۔؟ کیا ہوا۔۔۔؟'' اس کا چہرہ فق ہے۔

پتہ نہیں۔ سمجھ نہیں آ رہا۔ شاید کچھ لوگ اچانک ہی لڑ پڑے ہیں۔ خدا خیر کرے۔ یہ ابھی تک نہیں آئے۔ باہر ہی ہیں۔ الطاف آتا ہی ہوگا۔ تم اتنی فکر مند کیوں ہو۔ گلی محلے میں لوگ اکثر یوں ہی لڑ پڑتے ہیں۔

آپ کو نہیں پتا کیا کہ یہاں کیسا ماحول ہے آج کل۔ وہ اپنے لہجے میں جھنجھلاہٹ دبانے کی کوشش کرتے ہوئے کہتی ہے۔ اسی وقت کسی بچے نے آلو بم چھوڑا اور وہ گز بھر اچھل پڑی۔ اس کا پندرہ سالہ بیٹا عامر بالکونی میں نکلنا چاہتا ہے تو وہ اسے پیچھے گھسیٹ لیتی ہے۔ ''ممی دیکھنے دیجیے۔ ذرا سچویشن تو معلوم ہو جائے۔ صفیہ کو عامر اس لمحے اچانک بڑا ہوتا معلوم ہوتا ہے۔ بڑا اور سنجیدہ۔ چند منٹوں بعد پورا ماحول جیسے ایک اطمینان کی سانس لیتا ہے۔ پرلی گلی میں بسے سنار کا بڑا بیٹا بہت زیادہ پی آیا تھا اور چھوٹے بھائی پر ہاتھ اٹھا بیٹھا تھا۔ پھر گھر کی عورتیں بھی آپس میں الجھ گئی تھیں۔ صفیہ ہنسنے لگی۔ ایسے موقعوں پر نور محمد چاچا اپنی داڑھی ہلاتے باہر نکل آیا کرتے تھے اور ڈانٹ ڈپٹ کر کے کبھی سمجھا بجھا کر معاملہ رفع دفع کرتے تھے۔

اب دبک کے گھر میں بیٹھ جاتے ہیں۔ بھاوج کا لہجہ تلخ تھا اور رنجیدہ بھی۔ کون سنتا ہے ان پرانے دقیانوس بڈھوں کی جو امن و آشتی کی باتیں کرتے اور لڑنے والوں میں صلح کرایا کرتے تھے۔ وہ اب آؤٹ ڈیٹیڈ ہیں۔

اور کاکی............

کاکی کو مرے تین سال ہو گئے۔

صفیہ نے ٹھنڈی سانس لی۔ گرہستی کی گاڑی ڈھوتی۔ کچے پکے بچے پیدا کرتی۔ ان کے شادی بیاہ زچگی اور چاپے نمٹاتی۔ محدود آمدنی کو ربڑ کی طرح کھینچنے کی کوشش کرتی، اپنی صحت کی طرف سے لاپروا۔ کاکی اور اماں دونوں نہیں رہی تھیں۔ پچھلی بار صفیہ گھر آئی تو تھیں۔ اس کا یہ بیٹا جو ساتھ آیا ہے کوئی سال بھر کا تھا۔ اس نے بدا کے گاؤں سندیسہ بھجوایا تھا اور وہ دوسرے ہی دن چلی آئی تھی۔ کڑھی ہوئی چادر میں اس کا گورا بھرپور جوان چہرہ چاند کی طرح چمک رہا تھا۔ کجراری آنکھیں مٹکا کر اس نے صفیہ کے بیٹے سے کہا تھا۔ ہم کا چونھ لیو۔ ہم تہار موسی لاگیں۔

پھر پلو میں ہاتھ ڈال کر چاندی کا موٹا سا کڑا اس کے ہاتھ میں پہنا دیا تھا۔ پھر کاکی آئی تھیں گھٹنوں پر ہاتھ دھرے۔ ان کی آنکھوں میں موتیا بند اتر رہا تھا اور جوڑوں میں گٹھیا۔ میلی دھوتی کے آنچل سے کھول کر مڑا تڑا پانچ روپے کا نوٹ صفیہ کے بیٹے کو دیا تھا۔ ان کے جانے کے بعد اماں نے کہا تھا۔ بڑے لالہ تو گزر گئے۔ للائن کو ان کا بیٹا زیادہ پیسے نہیں دیتا۔ کہتا ہے بوڑھیا بلا وجہ خرچ کرتی رہتی ہے۔ اب ان کے دیے پانچ روپے تبرک سمجھو۔

یہ کالو بڑا ہو کر ایسا نکلا۔ چھوٹا تھا تو اماں کے پلو سے بندھا بندھا پھرتا تھا، ملے تو گوشمالی کردوں۔

اماں نے ٹھنڈی سانس لی۔ تمھارے ابا کے بعد کیا میرے پاس بھی کبھی زیادہ پیسے ہو پاتے ہیں۔ دو روٹی کھلا کر لڑکے سمجھتے ہیں کہ ماں کو کسی اور چیز کی ضرورت نہیں۔ اب تم آئی ہو بچوں کے ساتھ کیا تمھیں میں خالی ہاتھ بھیج دوں؟ اماں اور للائن کے دکھ اب ایک ہی تھے۔

صفیہ کے شوہر ان دنوں دبئی جانے کی سوچ رہے تھے۔ ویسے بھی اچھی ملازمت میں تھے۔ اسے کسی چیز کی ضرورت نہیں تھی۔ لیکن ایسا کہہ کر اماں کا دل نہیں دکھانا چاہتی تھی۔ کئی حیلے تراش کر اس نے اماں کو پانچ سو روپے دینے چاہے تھے کہ رکھ لیں، وقت بے وقت کام آئیں گے۔ لیکن اماں رونے لگیں، بیٹی سے پیسے لے لوں؟ یہی ذلت باقی ہے کیا؟ وہ تیری سہیلی بدا نے بھی ایک بار للائن کو ایسے ہی ذلیل کیا تھا۔ انھوں نے تو یہ خیال بھی نہیں کیا کہ بیاہی ہے اور اولاد والی بھی۔ نکال کر چپل دو لگائے اس کو۔ بیٹا میرا سر ابھی اونچا ہے۔ دو چار دس دے کر ہی وداع کر دوں گی۔ ہاں پانچ سو نہیں دے سکتی۔ اماں کی اور للائن کی اقدار بھی ایک ہی تھیں۔ صفیہ کی آنکھیں نم ہو اٹھیں بدا اس سے تھوڑی ہی بڑی تھی، لیکن اتنی کم عمری میں بیاہی گئی تھی کہ صفیہ کی شادی ہونے تک اس کے یہاں کئی بچے ہو چکے تھے۔ اب تو وہ نانی دادی بھی ہو چکی ہوگی۔ پتا نہیں سسرال وہیں ہے یا یہ لوگ کہیں اور چلے گئے۔ سندیسہ بھجوانے پر کیا اب بھی ویسے ہی دوڑی آ سکے گی۔ بھاوج سے اس نے پوچھا تو وہ صفیہ کا منہ دیکھنے لگی

"کون بدا...راجا رام کی بہن؟"

ہاں وہی اور کون؟

وہ بھی مرگئی۔ کب کی، کاکی کے سامنے ہی مری تھی۔

بدا مرگئی۔ یکا یک کسی نے پھونک مار کر سارے شہر کے دیے گل کر دیے۔

راجا رام کی فیملی تو محلے میں ہے نا؟ بہت دیر کی خاموشی کے بعد صفیہ نے رنجیدہ لہجے میں پوچھا۔ ہے تو۔ بھاوج کا لہجہ سپاٹ تھا۔ کسی سے کہلوا دینا میں آئی ہوئی ہوں۔ کالو ضرور آئے گا۔ نہیں آسکا تو میں جاؤں گی۔ بھاوج کوئی جواب نہ دے کر خاموشی سے رات کے کھانے کی تیاریوں میں لگ گئی۔ گہری ہوتی شام میں دھن تیرس کا میلہ رواں دواں تھا۔ ایک سناٹا صفیہ کے اندر اترنے لگا۔ یہ کوئی مرنے کی عمر تھی، پچاس کو بھی نہیں پہنچ سکی۔ اماں نہیں، کاکی نہیں، بدا نہیں، سناٹے سے ڈر کر وہ عامر اور ریشماں سے باتیں کرنے لگی۔

"تم لوگ پٹاخے نہیں لائے"

"پٹاخوں سے مجھے ڈر لگتا ہے پھوپھی" ریشماں دھیرے سے کہتی ہے۔

"کبھی جل گئی تھیں کیا بیٹا؟"

سارا شہر جل گیا تھا پھوپھی۔ ریشماں کے لہجے میں ایک درد تھا۔ ایک کاٹ اور چہرے پر خوف۔

سناٹا صفیہ کے دل میں اور گہرا ہو گیا۔ وہ گھبرا کر دوبارہ بالکونی میں آگئی۔ محلے میں چھوٹی دیوالی کے دیے جگنوؤں کی طرح جھلمل جھلمل کرنے لگے تھے۔ سڑک پر ایک چھوٹی سی لڑکی کروشیا سے بنے خوان پوش سے ڈھکی پیتل کی تھالی لیے لپ جھپ چلی جا رہی تھی۔ بچی کے نقوش بے حد مانوس اور جانے پہچانے سے تھے۔

"یہ آپ کے کالو...... ارے راجا رام کی بیٹی ہے" ریشماں جو صفیہ کے پیچھے پیچھے چلی آئی تھی کہہ رہی تھی۔ پکارو، پکارو، بلاؤ اسے صفیہ نے بے چین ہو کر جھنجی سے کہا: بلاؤ نا ریشماں، کیا نام ہے اس کا؟

شاید ہی آئے، ریشماں نے اسے پکارا۔ منجو۔ او منجو۔ منجو گھر کے چبوترے تک آکر رک گئی۔ صفیہ تیز تیز قدموں سے سیڑھیاں اتر کر نچلی منزل پر آگئی۔ چق ہٹا کر اس نے بچی سے کہا" اوپر چڑھ آؤ بیٹا۔ کمرے میں تو آؤ"

لڑکی بہت جھجکتی ہوئی اوپر آئی۔ صفیہ نے بڑھ کر اسے گلے سے لگایا۔ وہ حیران ہو کر اس اجنبی عورت کو ٹکر ٹکر دیکھنے لگی۔

"اپنے بابو جی سے کہنا" قیمتی لباس والی اس پختہ عمر خوبصورت عورت نے منجو سے کہا، منجو نے درمیان سے بات کاٹ دی۔ "ہم انھیں پاپا کہتے ہیں۔"

صفیہ ہنسنے لگی۔ اچھا بھائی اپنے پاپا سے کہنا، الطاف چاچا کی بڑی دیدی آئی ہیں تو تم ان سے ملنے نہیں آئے۔ اور یہ بھی کہنا کہ تمھارا نام تو کالو تھا تم راجا رام کب سے ہو گئے۔ اور پتہ ہے۔ صفیہ نے بچی کو لپٹائے لپٹائے دھیرے سے اس کے کان میں کہا۔" کالو ہی نہیں کالو بھالو خالو' حیرانی کی جگہ لڑکی کے چہرے پر مسکراہٹ کھیلنے لگی۔ پھر وہ ایک دم سے ہنس پڑی۔

"آپ کون ہیں؟ اس نے صفیہ سے آخر سوال کر ہی دیا۔

"ہم تُہار پھوا لاگیں ہو۔۔۔"

صفیہ نے اس کے سر پر پیار سے ہاتھ پھیرتے ہوئے سوچا کہ اس نے بدا کا تھوڑا سا قرض چکا دیا ہے۔ لڑکی ہنستے ہنستے پھر حیران ہو گئی۔ اس گھر میں اس کی پھوا کیسے آسکتی ہے؟ مگر محبت کی مٹھاس کا ذائقہ اس کی سمجھ سے پرے نہیں ہے۔ کسی کی سمجھ سے بھی نہیں ہوتا۔ واپس جاتے ہوئے وہ صفیہ کی طرف دیکھ کر مسکراتی ہے۔

الطاف کے منع کرنے کے باوجود صفیہ کالو کے یہاں جانے پر تلی رہی۔ راجا رام اب یہاں نہیں آتا۔ الطاف نے بتایا تھا۔ بس کہیں دکھائی دیتا ہے تو دعا سلام ہو جاتا ہے۔ کئی بار تو محسوس ہوا ہم دونوں ہی دعا سلام سے بھی کترا رہے ہیں۔

وجہ۔۔۔؟

آپا بھولی تو نہیں ہو تم۔ بس بال کی کھال نکالتی ہو۔ وہ کسی پارٹی میں شامل ہو گیا ہے۔ دو سال پہلے شہر میں بڑی کشیدگی ہوگئی تھی۔ اس وقت دیواروں پر نعرے لکھنے میں سنا ہے اس کا بھی ہاتھ تھا۔ کیا ضرورت ہے اس کے یہاں جانے کی۔

الطاف، تم اور راجا اسکول میں ایک ساتھ پڑھتے تھے۔ ایک دو درجے آگے پیچھے شاید۔ صفیہ کے لہجے میں دکھ تھا۔

ہاں نور محمد چچا کے باغ سے امرود بھی ساتھ ہی چراتے تھے۔ پھر ایک برا چچا کی چھت پر چور کودا تھا تو ہم دونوں ساتھ ہی اسے پکڑنے دوڑے تھے۔

"اور محلے کی بجبجاتی نالیاں صاف کرنے کے لیے تمھارے اسکول نے شرم دان کی اسکیم بنائی تھی تو تم دونوں بھائیوں نے ساتھ ساتھ صفائی کی تھی......" بوجھل دل کے ساتھ بات کرتی صفیہ کے چہرے پر مسکراہٹ کی لکیریں رینگنے لگی تھیں۔ نہ جانے کتنے دن تک اس نے کالو کو اس بات پر چڑایا تھا۔ وہ ہاتھ پیر پھینک کر لڑنے والا چھوٹا لڑکا اب تک اچھے خاصے کاروبار کا مالک ہے۔ شادی شدہ ہے اور کئی بچوں کا باپ۔ مگر ذہن میں وہی تصویریں چلتی ہیں اس کی۔ وہ جو صفیہ کی رخصتی کے وقت آنکھیں ٹپٹپا ٹپٹپا کر آنسو پی رہا تھا۔ اسے کسی نے ورغلایا ہے۔ کس نے سکھایا اسے یہ سب؟

وہ سامنے چبوترے پر ہی بیٹھا مل گیا تھا۔ جھانویں سے رگڑ رگڑ کر پیر صاف کرتا۔ چبوترہ بالکل ویسا ہی تھا۔ کونے میں اس کی بیٹیوں کا بنایا ہوا گھروندا سر

اٹھائے کھڑا تھا۔ شام کو اس کی منڈیروں پر رکھی دیوں کی لویں انسانی امیدوں کی طرح جگمگا اٹھیں گی۔ صفیہ کا دل جیسے کسی نے مٹھی میں لے کر مروڑا۔ صفیہ کو دیکھ کر وہ ہڑ بڑا گیا تھا اور کچھ دیر یونہی دیکھتا رہا تھا۔ بہت سے پل ان دونوں کے درمیان سے گزر گئے تھے۔

چینہت ہو کہ ناہیں؟ صفیہ نے اس میٹھی بولی میں کہا جو عرصہ ہوا سنائی دینا بند ہو گئی تھی۔ وہ بولی جو راجا رام بول سمجھ سکتا تھا۔ دبئی میں کوئی نہیں۔

پہچان رہے ہیں۔ صفیہ دیدی ہو۔ کب آئیں؟ اس کے لہجے میں جوش و مسرت کا کوئی شائبہ نہیں تھا۔ صفیہ پر اوس سی پڑ گئی۔

''معلوم تو ہوا ہوگا کہ ہم آئے ہیں پھر آئے کیوں نہیں؟

وہ سر کھجانے لگتا ہے۔ کاروبار پھیلا لیا ہے۔ دس جھمیلے ہیں۔ فرصت نہیں ملتی۔ وہ بیوی کو آواز دیتا ہے۔ ''منجو کی ماں۔''

سنا ہے ویسے بھی آنا جانا بند کر رکھا ہے۔ بھیا سے جھگڑا کیا ہے کیا؟ اس کا بھی منہ پھولا ہوا تھا۔ وہ صفیہ کی بات کا کوئی جواب نہیں دیتا۔ بدستور جھانویں سے پیر رگڑتا رہتا ہے، پھر بیوی کو دوبارہ پکارتا ہے۔ ''تنی چاہ لیے آؤ دو گلاس۔''

چائے وائے چھوڑو۔ بچے کتنے ہیں۔ کتنے بڑے ہوئے۔ لڑکیوں کو پڑھا رہے ہو کہ نہیں؟ پچھلی بار آئی تو تم سے ملاقات نہیں ہو سکی تھی۔ تم باہر گئے ہوئے تھے۔ تمھاری دلہن میکے گئی ہوئی تھی۔ بدا آئی تھی اور کاکی بدا کو کیا ہو گیا تھا کالو...... بدا کیسے مر گئی۔

راجا رام کی بیوی ہاتھ میں دو اسٹیل کے گلاس لیے ہوئے باہر آئی۔ ساڑی کا آنچل ماتھے تک کھنچا ہوا تھا۔ اس نے گلاس پیڑھی پر رکھے۔ صفیہ کو پرنام کیا۔

اس سے پوچھ لو۔ یہی سب بتائے گی۔ بیٹھ جاؤ ہو۔ بدا دیدی کی سکھی ہیں۔ وہ چائے لیے بغیر اٹھنے لگا۔ ''دکان جانا ہے دیر ہو رہی ہے''

صفیہ نے کالو کی بیوی کی طرف دیکھا۔ نصف گھونگھٹ کے اندر اس کی آنکھوں میں کوئی جذبہ ایسا نہیں تھا جسے پڑھا جا سکے۔ بس ایک اجنبی لاتعلقی کا احساس۔

''چائے نہیں پیتی ہمیں'' صفیہ کی آواز میں غم و غصہ دونوں ہیں۔ ''کالو ہم تم سے ملنے آئے تھے۔'' وہ اٹھ کھڑی ہوئی اچانک دروازے میں سے دوڑتی ہوئی منجو نمودار ہوئی۔ اس کے پیچھے ذرا بڑا ایک لڑکا تھا جو شاید اس کا بھائی تھا۔ صفیہ کو دیکھ کر منجو ٹھٹھک کر رک گئی۔ اس پل کو اس کے چہرے پر حیرت کا سایہ ابھرا لیکن دوسرے ہی لمحے بادلوں سے جھانکتے سورج کی کرنوں جیسی شرمیلی مسکراہٹ پورے چہرے کو روشن کر گئی۔ گول مٹول چہرے کے بھرے بھرے گالوں میں دو بے حد مانوس، ننھے ننھے گڑھے۔ کالی کجراری آنکھیں عین مین بدا۔

''پاپا...... پاپا ہو...... ای ہمار پھوا لاگیں۔'' صفیہ کے بہت قریب آکر اس نے صفیہ کو چھو کر کہا اور اس کے چہرے کے نقوش میں بدا جیسے اچانک زندہ ہو اٹھی۔

□□□

(آزادی کے بعد اردو افسانہ/ مرتبین۔ گوپی چند نارنگ، ارتضیٰ کریم، اسلم جمشید پوری سے ماخوذ)

مولانا آزاد کی سائنسی بصیرت

مصنف: وہاب قیصر

''مولانا آزاد کی سائنسی بصیرت'' میں ڈاکٹر وہاب قیصر نے مولانا آزاد کی سوانح، تحریریں، صحافت اور وزارت میں جہاں کہیں بھی سائنسی مزاج، سائنسی اصول اور سائنسی برتاؤ نظر آئے انھیں ضبط تحریر کیا ہے۔ پانچ ابواب پر مشتمل اس کتاب میں موصوف نے مولانا کے لیے سائنس کی تعلیم کا حصول، مولانا آزاد کا سائنسی شعور، غبار خاطر سائنس کے تناظر میں، البیرونی اور جغرافیۂ عالم اور مولانا آزاد اور ملک میں سائنس کی ترقی جیسے موضوعات سے بحث کی ہے۔

صفحات: 180، قیمت: -/109 روپے

نوٹ: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دھلی کی جانب سے طلبہ اور اساتذہ کے لیے بالترتیب 45% اور 40% کی خصوصی رعایت دی جاتی ھے۔ تاجران کتب کو قومی اردو کونسل کے ضوابط کے مطابق رعایت دستیاب ھے۔ ادارہ

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، شعبۂ فروخت: ویسٹ بلاک-8، ونگ-7، آر. کے. پورم، نئی دہلی-110066

ایم مبین

اردو میں بچوں کا ادب

اکیسویں صدی کے آغاز کے ساتھ ہی اردو زبان میں بچوں کا ادب تین صدیوں پر محیط ہوگیا ہے۔ انیسویں صدی کے آخر میں لکھا جانے والا بچوں کا ادب بیسویں صدی میں لکھا گیا بچوں کا ادب اور اب نئی صدی میں لکھا جانے والا بچوں کا ادب انیسویں صدی کے اواخر کا زمانہ اردو نثر کا کسی حد تک ابتدائی دور تھا۔ اس دور میں نثر اتنی موثر نہیں لکھی جا رہی تھی۔ ناولوں کی ابتدا ہو چکی تھی لیکن ان پر داستانوں کا اثر حاوی تھا۔ افسانوں کے نقوش ابھر رہے تھے۔ وہ بھی ''توبۃ النصوح'' کے حصوں کی شکل میں۔

شاعری میں بھی بچوں کے لیے لکھنے پر کوئی توجہ نہیں دی گئی تھی۔ دراصل اس وقت شاعری میں غزل کا دور تھا اور ''غزل'' بچوں کی چیز نہیں تھی۔ نظموں پر توجہ کم تھی اس لیے کوئی ایسی تخلیق سامنے نہیں آتی تھی جو بچوں کے لیے ہو۔ اس زمانے میں بچوں کو ''گلستان سعدی'' کی حکایتیں اور ''بوستان'' کے چند دفاتر پڑھا کر ان کی تعلیم کے فرض سے سبک دوش ہو جانا سمجھا جاتا تھا۔

ہندوستان کے پاس زمانۂ قدیم سے ''پنچ تنتر'' کی کہانیوں کا خزانہ موجود تھا اور چین سے ''ایسپ کی حکایتیں'' بھی درآمد ہوگئی تھیں لیکن اس کے باوجود بچوں کی ابتدائی تعلیم کے لیے ان کا استعمال نہیں کیا جاتا تھا۔

بیسویں صدی کے آغاز کے ساتھ تعلیم کا دائرہ وسیع ہوا۔ تعلیم گھروں مدرسوں سے نکل کر سرکاری تحویل میں چلی گئی۔ اس کی وجہ سے کچھ صورت حال بہتر ہوئی۔ بچوں کے لیے ''غنچہ''، ''پھول'' وغیرہ رسالے شائع ہونے لگے اور ان رسالوں میں بچوں کے لیے بڑے ادیب و شاعر بھی باقاعدگی سے لکھنے لگے۔ ایک کوشش حفیظ جالندھری نے ''عمر وعیار'' لکھ کر کی۔ یہ کتاب خاص طور پر بچوں کے لیے لکھی گئی تھی اور فارسی کی معروف داستان ''طلسم ہوشربا'' کے ایک کردار عمر وعیار کے کارناموں پر مشتمل تھی۔ یہ کتاب اتنی مقبول ہوئی کہ اسے بچوں کے ساتھ ساتھ بڑے بھی شوق سے پڑھتے تھے۔ اس سے پہلے اسماعیل میرٹھی نے بچوں کے لیے جو درسی کتابیں لکھیں ان سے بھی اس رجحان کو فروغ ہوا اور بچوں کے لیے لکھی گئی علامہ اقبال کی نظموں سے بھی۔

1940، 1950 کے دہے میں بچوں کے ادب پر خاص طور پر توجہ دی گئی۔ امتیاز علی تاج نے ''چچا چھکن'' کے کردار پر جو ڈرامے اور انشائیے لکھے وہ بڑوں کی توجہ کا مرکز اور بچوں کے ادب کا ایک حصہ بن گئے۔ اس دور میں خواجہ حسن نظامی نے جو انشائیے لکھے وہ بھی اس زمرے میں شامل کیے جا سکتے ہیں۔ مچھر، مکھی وغیرہ مچھران کے انشائیے نہ صرف بڑے پسند کرتے تھے بلکہ وہ بچوں کی تعلیم و تربیت کے لیے درسی کتب میں بھی استعمال کیے جاتے تھے۔ آزادی کے بعد ایسے کئی ادارے وجود میں آئے جو صرف بچوں کے لیے کتابیں شائع کرتے تھے۔ ''پنچ تنتر'' اور ''ایسپ کی حکایات'' کی طرز پر ادب تخلیق نہیں ہوا۔ نہ ہی انگریزی یا دیگر یورپی زبانوں کے مہاتی نثر پاروں سے استفادہ کیا گیا۔ بلکہ پوری طرح عربی اور فارسی کا ادب ہی بچوں کے لیے لکھے جانے والے ادب کا منبع رہا۔ راجہ رانی، شہزادے، شہزادیاں، بادشاہ، جادوگر، درویشوں کی کہانیاں۔ زیادہ تر کہانیوں کا آغاز ایک بادشاہ تھا، ایک شہزادہ تھا، ایک ظالم دیو تھا، پرستان کی ایک پری تھا، جیسے جملوں سے ہوتا اور اسی ماحول میں کہانی آگے بڑھ کر ختم ہو جاتی تھی۔ ان چیزوں کو پڑھتے ہوئے بچے ایک عجیب و غریب دنیا میں چلے جاتے تھے اور سوچتے تھے کہ کیا سچ مچ ہمارے ماضی میں دیو تھے، جن تھے، پریاں تھیں جادوگر تھے؟ جو ظالم بھی تھے، میزبان بھی تھے جن کے پاس جادوئی قوتیں تھیں؟

ان کہانیوں کو پڑھنے کے بعد وہی بچے جب تاریخ کا مطالعہ کرتے تو تذبذب کا شکار ہو جاتے تھے۔ انھیں تاریخ میں کہیں بھی ایسا دور نظر نہیں آتا تھا جب زمین پر ظالم دیو تھے، جادوگر تھے یا ایسے بادشاہ اور شہزادے، پریاں اور شہزادیاں تھیں جن کا کہانیوں میں ذکر آتا ہے۔

بیسویں صدی میں اردو شاعری نے انیسویں صدی کے مقابلے میں بچوں کے لیے مثبت رول ادا کیا اور شاعری میں بچوں کو جس طور نظر انداز کیا گیا تھا اس کا ازالہ کرتے ہوئے بیسویں صدی میں شاعری میں بچوں پر خصوصی توجہ دی گئی اور بچوں کے لیے اچھا ادب تخلیق کیا گیا۔ بیسویں صدی کے ابتدائی برسوں میں غنچہ، پھول وغیرہ رسائل نے بچوں کے ادب کی کمی پوری کی تھی۔ بعد میں کھلونا، پیام تعلیم، کلیاں، نور ہلال، نرالی دنیا، گل بوٹے، اچھا ساتھی، امنگ وغیرہ رسائل بچوں کے ادب کے افق پر روشن رہے۔ ''کلیاں'' میں وہی داستانی پیرائے کی کہانیاں شائع ہوتی تھیں لیکن ''کھلونا'' نے اردو میں بچوں کے ادب کو ایک نیا رجحان دیا۔ اس نے اردو کے تمام بڑے قلمکاروں سے بچوں کے لیے کہانیاں، نظمیں، ڈرامے اور ناول لکھوائے۔ خاص طور پر ہر سال ''کھلونا''

کا جو سالنامہ شائع ہوتا تھا اس میں لکھنے والے تقریباً سبھی اردو کے معروف ادیب و شاعر ہوتے تھے۔ اس لیے ان کی تحریریں عصری زندگی کے تقاضوں کے تحت، بچوں کی نفسیات اور مسائل کو مدِ نظر رکھ کر لکھی ہوتی تھیں۔ یہ تحریریں سبق آموز ہونے کے ساتھ ساتھ دلچسپ بھی ہوتی تھیں۔

''کھلونا'' کے بند ہونے کے بعد اس روایت کو آگے بڑھانے کا کام ''امنگ''، ''نرالی دنیا''، ''گل بوٹے'' نے کسی حد تک ضرور کیا لیکن یہ رسائل وہ معیار نہیں اپنا سکے۔ ان میں آج بھی ان میں جادوگروں اور پریوں کی کہانیاں شائع ہوتی ہیں۔ ''نرالی دنیا'' کی اشاعت تو اب بند ہی ہوگئی ہے۔

اردو میں کسی بھی منفرد کردار پر کسی بھی ادیب نے اتنی زیادہ کہانیاں نہیں لکھی ہیں جس طرح امتیاز علی تاج نے ''چچا چھکن''، کے کردار پر کچھ تحریریں لکھ کر اسے زندۂ جاوید کردیا تھا۔ ایس خان نے اسی کردار کی طرز پر ''ٹین استاد'' کے کردار کی تخلیق کی ہے اور اس کردار اور اس سے متعلقہ کرداروں کو لے کر جو کہانیاں بنی ہیں ان میں تفریح اور مزاح کا عنصر نمایاں ہے جو بچوں کے لیے لطف کا سامان مہیا کرتا ہے اور عصری زندگی کی عکاسی کرنے کے ساتھ ساتھ ان کو جن پری، جادوگر، بھوت کے مایا جال سے نکالتا ہے۔

مغرب میں بچوں کا ادب حکایات اور طلسماتی کہانیوں کے جال سے نکلا تو مہماتی اور جاسوسی ناولوں کے جال میں پھنس گیا۔ رائڈر ہیگرڈ اور ایڈگر رائز بروس نے جو مہماتی ناول لکھے انھیں بڑے تو شوق سے پڑھتے تھے وہ تحریریں بچوں کو بھی بڑوں کی طرح اپنا گرویدہ بنالیتی تھیں۔ رائیڈر ہیگرڈ کے افریقہ کے تاریخی پس منظر پر مبنی ناول بڑوں کے ساتھ ساتھ بچے بھی شوق سے پڑھتے تھے۔ ان ناولوں کے تراجم اردو میں مظہر الحق علوی نے کیے ہیں جنھیں ''کلیاں'' نے قسط وار شائع کیا تھا اور پھر نسیم بک ڈپو نے کتابی شکل میں شائع کیا۔ اردو میں ایک اور ادیب، ایڈگر رائز بروس، شوق سے پڑھا جاتا تھا۔ ''ایڈگر رائز بروس نے شہرۂ آفاق کردار ''ٹارزن'' کی تخلیق کی ہے۔ ایک زمانے میں ''انور کمال حسینی'' نے ''ایڈگر لائز بروس'' کے ''ٹارزن'' سیریز کے کئی ناولوں کا اردو میں ترجمہ کیا تھا جسے پنجابی پستک بھنڈار دہلی نے شائع کیا تھا۔ ٹارزن ''سیریز'' کی وہ کتابیں شائع ہوتے ہی ہاتھوں ہاتھ بک جاتی تھیں۔ اب وہ کتابیں نایاب ہیں۔ اگر دوبارہ انھیں شائع کیا جائے تو بچوں کو اپنی طرف متوجہ کرسکتی ہیں۔ ان کے علاوہ ''بروس'' کے ''مریخ'' سیریز کا ترجمہ ایم۔ جے۔ عالم نے کیا تھا لیکن وہ ناول بچوں کو اتنا متاثر نہیں کرسکے۔

مہماتی اور جاسوسی ناولوں کے بعد مغرب میں بچوں کے ادب میں کامکس کا دور آیا۔ سپرمین، بیٹ مین، اسپائڈر مین، ہی مین اور ہلک جیسے سیکڑوں کردار تخلیق کیے گئے اور ان کرداروں پر مبنی ہر مہینے سیکڑوں کامکس بازار میں آتے تھے اور بچے ان پر ٹوٹ پڑتے تھے۔ کامکس کی آمد نے بچوں کی کتابوں، ناولوں اور رسائل پر منفی اثر ڈالا۔ بچے کہانیاں پڑھنے کے بجائے کامکس پڑھنا پسند کرتے تھے۔ چند جملوں میں وہ کہانی کا پس منظر پڑھتے اور تصویریں دیکھ کر وہ کہانی کے ساتھ ساتھ آگے بڑھتے۔ کامکس کی آمد نے بچوں کے ''تصور'' کی صلاحیت کو متاثر کیا۔ پہلے بچے جو پڑھتے تھے اپنے تصور کی آنکھ سے ان مناظر کو دیکھتے تھے اس لیے ان کی تصور کی صلاحیت میں اضافہ ہوتا تھا لیکن کامکس میں کسی منظر کے تصور کی ضرورت ہی نہیں ہوتی تھی۔ منظر تصویروں کی شکل میں سامنے ہوتا تھا۔ اردو میں کامکس اپنے لیے کچھ خاص جگہ نہ بنا سکے اس کی وجوہات معاشی اور تکنیکی تھیں۔ کامکس تیار کرنے میں آرٹسٹوں کی خدمات لازمی تھیں اور انھیں اس کام کے لیے خاصہ اونچا معاوضہ دیا جاتا تھا۔ پھر کامکس عمدہ کاغذ پر آفسیٹ، بلاک کی طباعت کے ساتھ شائع ہوتے تھے۔ اس پر کافی خرچ ہوتا تھا۔ عام اردو ناشرین اور قارئین بھی اس خرچ کے متحمل نہیں ہوسکتے تھے۔

اس وجہ سے اردو والوں نے کامکس پر توجہ ہی نہیں کی۔ جو بچے کامکس کے شوقین ہیں وہ دیگر زبانوں، یا انگریزی کی کامکس پڑھ کر اپنا شوق پورا کرلیتے ہیں۔

ایک عام اندازے کے مطابق ہندوستان میں 20 کروڑ اردو داں موجود ہیں اور کم از کم 5 سے سات کروڑ بچے اردو پڑھتے لکھتے ہیں۔ بچوں کے لیے اردو میں سات آٹھ اچھے رسائل بھی موجود نہیں ہیں اور ان میں سے کسی بھی رسالے کی اشاعت پانچ ہزار سے زائد نہیں ہے۔ بچوں میں مطالعے کا رجحان پیدا کرنے کے لیے کوئی کوشش نہیں کی جاتی۔ انھیں صرف درسی کتابوں کا کیڑا بنادیا جاتا ہے۔ پورے ہندوستان میں اردو زبان کی تعلیم دینے والے پرائمری، مڈل اور ہائی اسکولوں کی تعداد 20، 25 ہزار سے کم نہیں ہوگی۔ اگر ان اسکولوں میں بچوں کے لیے بچوں کے ایک یا دو رسالے بھی باقاعدگی سے خریدے جائیں تو ان رسائل کی تعداد اشاعت 25 سے 40 ہزار کاپیوں تک پہنچ جائے گی۔

آج وقت کی سب سے بڑی ضرورت بچوں میں مطالعے کا شوق پیدا کرنا ہے۔ اگر بچوں میں بچپن سے مطالعے کا شوق نہیں ہوگا تو وہ بڑے ہوکر بھی پڑھنے لکھنے پر توجہ نہیں دے سکیں گے۔

ہر ماں باپ اور اساتذہ کی سب سے بڑی ذمے داری یہ ہے کہ وہ بچوں کو ہر ماہ پڑھنے کے لیے ایک دو بچوں کے رسائل یا کتابیں ضرور دیں۔

□□□

پتہ:
303 Classic Plaza, Teen Batti
Bhiwandi-421302
Dist. Thane (Maharashtra)

اشفاق محمد خاں

حبیب تنویر ایک شخص — ایک شخصیت

اَرنسٹ ہمنگوے (Earnest Hemingway) کا قول ہے کہ ''ادیب کو کسی ولی اللہ کی طرح دیانت دار اور ایماندار ہونا چاہیے' وہ یا تو ایماندار ہوتا ہے یا ایمان دار نہیں ہوتا ہے' بالکل ایسے جیسے عورت یا تو با عصمت ہوتی ہے یا نہیں ہوتی ہے۔'' ہمنگوے نے یہاں ادیب کا لفظ وسیع معنوں میں استعمال کیا ہے۔ اس کی مراد دانشورانہ بالخصوص فنون لطیفہ کی فنکارانہ سرگرمیوں سے ہے' خواہ وہ کوئی شاعر ہو یا ادیب، یا موسیقار وغیرہ ان سب کے لیے اس نے دیانت دار اور ایماندار ہونے کی بڑی کڑی شرط لگائی ہے۔ شاید اس لیے کہ ان سب کو وہ ولی اللہ کی طرح دیکھنا چاہتا ہے اور ولی کا ایک خاص وصف یہ بتایا جاتا ہے کہ وہ اپنی ہی ذات کا موسن نہیں ہوتا اور نہ ہی کسی فرد کی خدمت کا منکر، بلکہ وہ اپنی ذات سے بے نیاز ہو کر آفاق میں گم رہتا ہے اور اس طرح اس کا ایمان اور فرد کی خدمت کا اقرار باہم دگر پیوست ہو کر اسے ایک ایسی آفاقی بصیرت بخشتے ہیں جو عام ذہنی اور روحانی سطحوں سے بہت بلند اور برتر ہوتی ہے۔ لہٰذا اس طرح کے اوصاف اور بصیرتوں کے حامل ادیب، شاعر، ڈراما نگار اور دوسرے فنکار اپنے عمیق تجربوں، مشاہدوں، مطالعوں اور پیہم ریاضتوں کے سہارے اپنی داخلی اور خارجی کیفیتوں کے مسلسل تصادم میں رہ کر جب کسی تخلیقی عمل سے گزرتے ہیں تو ان کا فن ایک اعلیٰ فنی اظہار کی شکل اختیار کر کے آفاقی یا الہامی تخلیق کار کا درجہ پاتا ہے۔ ہمنگوے نے جس خوبصورتی سے اور جن مختصر الفاظ میں ایک ادیب یا فنکار کے فرائض اور شخصیت کی تعریف بیان کی ہے اس سے بہتر اور جامع تعریف ممکن نہیں۔ اس تعریف میں سارا راز اس کے نزدیک انسان اور انسانی اقدار کا پوشیدہ ہے۔ بظاہر اس کی خواہش اور روئے سخن تمام جینیس (Genious) فنکاروں کی طرف معلوم ہوتا ہے مگر بعض جینیس ایسے بھی ہوتے ہیں جو اپنی تمام بصیرتوں اور اعلیٰ تصورات کے باوجود بشری کمزوریوں پر قابو نہ پا کر گمراہی کا شکار ہو جاتے ہیں اور ہوئے ہیں۔

بہر حال ہمنگوے ہر فنکار کو اس کی فنکارانہ سرگرمیوں کے ساتھ ساتھ زیادہ سے زیادہ صحت مند انسانی قدروں کا حامل بھی دیکھنا چاہتا ہے۔ اس خیال کی تائید میں یہاں مرزا سودا کا ایک شعر پیش کرنا شاید دلچسپی سے خالی نہ ہو۔ مرزا فرماتے ہیں:

آدمیت ہے بڑی شے نہ کہا شعر تو کیا
کس پہ واجب ہے ز ارشاد پیمبر اشعار

گویا مرزا سودا کے تئیں ایک محترم فنکار بننے کے لیے پہلے آدمی بننا ضروری ہے۔ یہاں سودا فن اور شخصیت میں ہم آہنگی کے طرفدار معلوم ہوتے ہیں اور سچ بھی ہے کہ آدمیت کے اوصاف اختیار کیے بغیر ایک بلند سیرت اور شخصیت کی تعمیر ممکن تو ہے مگر شاید ادھوری۔

یہ عجیب اتفاق ہے کہ میں نے ہمنگوے اور سودا کے خیالات وتصورات کو اپنا (Ideal) خواب سا بنا لیا اور بہت دنوں تک دہلی اور علی گڑھ کے گلی کوچوں میں طرح طرح کے فنکاروں سے ملاقات اور نیاز حاصل کرتا پھرا کہ شاید کہیں اپنے خواب کی تعبیر پا سکوں مگر میں تھک گیا اور بڑی مایوسی میں مبتلا ہوا۔

1954 کا سال بڑا مبارک سال ہے ایک دن میں حسب معمول اپنے مرحوم دوست اطہر پرویز (جامعہ دہلی) کے گھر پہنچا تو دیکھا کہ وہ اپنے ڈرائنگ روم میں ایک خوبرو، خوش قامت، خوش لباس، خوش اخلاق نوجوان سے محو گفتگو ہیں۔ میں خاموشی سے ایک کنارے کرسی پر بیٹھ گیا اور کافی دیر تک دونوں کی گفتگو بڑے صبر سے سنتا رہا مگر جب مجھ سے رہا نہ گیا تو میں نے ہی اطہر پرویز سے پوچھا کہ '' بھئی آپ کی تعریف؟'' اطہر پرویز اچھل پڑے اور بولے '' ارے بھئی اشفاق معاف کرنا یہ میرے بہت پرانے اور بڑے گہرے دوست ہیں۔ ابھی ابھی بمبئی سے آئے ہیں۔ میں ان سے مل کر اس قدر خوش ہوا اور باتوں میں اس قدر کھو گیا کہ تمہارا وجود اور عدم برابر ہو گئے۔ بہر حال ان سے ملو یہ ہیں حبیب تنویر۔ شاعر ہیں، ایکٹر ہیں، ڈراما نگار اور ہدایت کار بھی۔ حبیب نے بڑھ کر مجھ سے مصافحہ کیا اور مل کر خوشی کا اظہار بھی کیا۔ پہلی ہی ملاقات میں کچھ گفتگو کے بعد مجھے ایسا محسوس ہوا گویا مجھے مرزا سودا اور ہمنگوے کا آدمی مل گیا۔

حبیب تنویر کی شخصیت سے متعلق کچھ عرض کرنے سے پہلے صرف اتنا بتانا ضروری سمجھتا ہوں کہ حبیب احمد خاں ایک نجیب الطرفین، خوددار، باوقار، پٹھان خاندان سے تعلق رکھتے ہیں اور ان کا قلمی نام حبیب تنویر ہے اور اب اسی نام سے ہر جگہ جانے جاتے ہیں۔ وہ Selfmade قسم کے انسان ہیں۔ بی۔اے۔ پاس کر کے کم عمری میں گھر چھوڑا یعنی رائے پور (مدھیہ پردیش) سے بمبئی جیسے غارت گر ایمان شہر کو بسانا، طرح طرح کے نشیب وفراز حادثات سے دوچار ہونا، اپنی صلاحیتوں کو بروئے کار لانے کا کوئی موقع نہ ملنا، فلمی دنیا راس نہ آنا اور بالآخر ایک لمبی چھلانگ لگا کر ممبئی کے خرابے کو خیرباد کہہ کر ایک

دوسرے خرابے دہلی کو آباد کرنا وغیرہ ان تمام اذیتوں کو جھیلنا کسی معمولی انسان کے بس کی بات نہیں۔ اس طرح کا اعمال نامہ کسی دوریش صفت بندے کا ہی ممکن ہے اور ممکن ہے ایسا آدمی کبھی کبھی دل ہی دل میں خود کہتا ہو:

ہماری خودنگری کی حکایتیں ہیں لطیف
گزر گئی ہے زمینوں کو آسماں کہتے

میں ان ایام کو کبھی نہیں بھول سکتا، جب حبیب تنویر علی الصبح ہمارے مشترکہ دوست اطہر پرویز کے گھر سے خراماں خراماں چل کر بغل میں "کلیات نظیر اکبرآبادی" اور دوسرے کاغذات دبائے جمنا کے کنارے ایک ٹیلے پر واقع میرے پھوس کے جھونپڑے بلھ ہاؤس پہنچتے تھے اور جب کبھی ان کو پہنچنے میں دیر ہو جاتی تو میری بیوی کامنی مجھ سے کہتیں کہ "دیکھیے تو آج حبیب بھائی کیوں اب تک نہیں آئے" میں ان سے کہتا "ہاں ابھی دیکھتا ہوں ذرا ان کا حقہ تازہ کرلوں" کہ اتنے میں حبیب خود وارد ہو جاتے اور ہم لوگ ناشتہ کرنے بیٹھ جاتے۔ ناشتے کے بعد میں چلم بھر کر لاتا۔ پہلے خود دو ایک کش لگاتا پھر حبیب کے سامنے بڑھا دیتا۔ بس اب حبیب ہیں حقہ ہے اور چل رے خامہ بسم اللہ۔ "اللہ کی بھی یاد دلاتی ہیں روٹیاں" صبح 8 بجے سے مسلسل 2 بجے تک حبیب "کلیات نظیر" اور دوسری کتابوں کی ورق گردانی کرنے اور لکھنے کے کام میں اس قدر منہمک رہتے کہ دنیا و مافیہا کی خبر نہیں رہتی۔ ڈیڑھ بجے کے قریب کامنی آواز لگاتیں "کھانا تیار ہے" مگر میں نے اکثر دیکھا کہ وہ اپنے شوق تحریر اور ذوق تخلیق میں ایسے مستغرق رہتے کہ کامنی کی پہلی آواز صدا بصحرا ثابت ہوتی۔ وہ پھر دوبارہ ذرا بلند آواز سے کہتی "کہ حبیب بھائی کھانا ٹھنڈا ہو رہا ہے" اور میں بھی کچھ کہتا تب جا کر قبلہ حبیب صاحب انگڑائی لے کر فرماتے: "اچھا بھئی تو اب کھانا ہی پڑے گا۔" اس طرح حبیب کے ساتھ ہم لوگ کھانا کھاتے وہ باتیں کرتے جاتے اور لطف لے کر کھاتے بھی مگر بہت کم۔ شام 5۔6 کے درمیان بلھ ہاؤس کے باہر جمنا کے کنارے کی خشک ہوا کا لطف اٹھاتے۔ احباب حسب معمول روزانہ شام حبیب کے درشن کو آتے اور حبیب سے "آگرہ بازار" کی تخلیق کے سلسلے میں بے چینی سے سوالات کرتے۔ حبیب روزانہ کی کارگزاری پر روشنی ڈالتے اور احباب سے صلاح و مشورہ بھی کرتے۔ اس طرح یہ تخلیقی سلسلہ ڈیڑھ ماہ تک مسلسل جاری رہا۔ خدا خدا کر کے وہ دن بھی آگیا کہ "آگرہ بازار" کی تخلیق تکمیل کو پہنچ گئی اور اس کو اسٹیج پر لانے کے لیے حبیب تنویر کی ہدایت کاری میں ریہرسل بھی شروع ہوگئے۔

یہ سال بہر حال بڑا مبارک سال ثابت ہوتا ہے کہ ہمارے صوفی صفت شاعر ڈراما نگار ہدایت کار حبیب تنویر کی نئی زندگی کا آغاز ہوا اور 3 ماہ کی انتھک محنت اور ریاضت کے بعد "آگرہ بازار" ہندوستانی تھیٹر کے منچ سے (جامعہ دہلی میں) پہلی بار اسٹیج ہوا اور پہلی بار ہی اس قدر مقبول ہوا کہ حبیب تنویر کا نام ساری دلی میں گونج اٹھا۔ کئی شو دہلی میں ہوئے اور دہلی سے باہر بھی۔

جب حبیب تنویر کی پوشیدہ صلاحیتوں کا اندازہ "آگرہ بازار" دیکھ کر دہلی کے کچھ باذوق ڈراماسٹ اہل ثروت کو ہوا، جو اپنا الگ مقام اور حیثیت بھی رکھتے تھے تب انھوں نے حبیب کو اپنے ساتھ لے کر اپنی منشا، ماحول اور نظریے کے مطابق ہندوستانی تھیٹر کو ایک Aristocratic انداز کا تھیٹر بنانا چاہا مگر چونکہ حبیب تنویر کا مقصد منشا اور نظریہ ان حضرات سے بالکل مختلف تھا اس لیے ان کی تمام پیش کشوں کے باوجود حبیب صاحب ان کے شریک کار ہونے پر کسی طرح سے راضی نہ ہوئے اور ان سے صاف کہہ دیا کہ مجھے معاف فرمائیں مجھے اپنے فن اور نظریے Idealogy سے زیادہ کوئی چیز عزیز نہیں ہے اور یہ بھی کہ:

دولت مرے اجداد کی ٹھکرائی ہوئی ہے

حبیب تنویر کے کردار اور شخصیت سے متعلق یہ پہلا واقعہ میں نے پیش کیا ہے۔ اس ایک مثال سے ہی عظمتِ کردار کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ شخصیت کا یہ پہلو بڑے بڑوں کے یہاں نہیں ملتا، بلاشبہ اس قسم کے کردار کے انسان زندگی کے بے پناہ تلخ اور ترش حقائق کا ذائقہ شناس ہوتے ہیں اور انھیں طرح طرح کے نشیب و فراز سے گزرنا ہی پڑتا ہے۔ حبیب نے بھی اپنی شرافتوں اور نفاستوں کے ساتھ ساری زندگی بڑی ریاضت اور مشقت کے بعد ہی اپنی شخصیت کی تعمیر کی ہے اور فن کو جلا بخشی ہے۔

ہندوستانی تھیٹر سے ناطہ ٹوٹنے کے بعد ہم احباب یہ سوچنے پر مجبور تھے کہ اب پھر حبیب کو معاشی مشکلات کا سامنا کرنا پڑے گا اور وہی "تجھ سے بھی دلفریب ہیں غم روزگار کے" مصداق اب کوئی تخلیقی کام نہ ہوسکے گا۔ مگر واہ واہ:

ہونہار بروا کے ہوت چکنے پات

حبیب نے جلد ہی نیا تھیٹر" کی بنیاد ڈال دی، دیکھتے ہی دیکھتے چھتیس گڑھ کے فوک ایکٹرس (منڈلی) کے ساتھ مل کر حبیب نے اپنی ڈائرکٹرشپ میں مسلسل اس قدر خوبصورت، خوشنما، دلکش، دلچسپ اور پرمعنی ڈرامے اسٹیج کیے کہ دہلی والے حیرت میں پڑ گئے اور یہ سلسلہ بحمداللہ آج تک جاری ہے۔ قصہ بہت طویل ہے۔ اس لیے مختصراً عرض ہے کہ کاروبار شوق نے چاروں طرف دھوم مچادی "آگرہ بازار" سے "چرنداس چور" کی تخلیق تک نیا تھیٹر کے منچ سے فن ڈراما کی دنیا میں حبیب تنویر بحیثیت ڈراما نگار اور ہدایت کار قومی اور بین الاقوامی سطح پر شہرت پا کر ایک منفرد شخصیت بن کر سامنے آگئے۔ میرے نزدیک اس غیر معمولی اور غیر متوقع بڑی کامیابی کا راز صرف اور صرف حبیب تنویر کی گراں قدر ذاتی اور فنکارانہ شخصیت ہے جس کی تعمیر میں اگر ایک طرف سودا کی آدمیت، ہیمنگوے کی ولایت اور غالب کی مشکل پسند طبیعت جیسے اوصاف اور

عناصر شامل ہیں تو دوسری طرف مونیکا بھابی اور نگین بینی جیسی خدمت گزار دایاں اور بایاں بازو بھی برابر کے شریک کار رہے ہیں۔

شخصیت کے حوالے سے ایک بات اور یاد آگئی مردم شناسی کی صفت بھی ایک اعلیٰ انسانی شخصیت کی دین ہے اور یہ صفت بڑے فنکاروں اور دانشوروں کی پہچان بھی بن جاتی ہے۔ غالب نے اپنے ایک شعر میں اس صفت کو کچھ اس انداز سے بیان کیا ہے:

تھی نگہ میری نہاں خانۂ دل کی نقاب
بے خطر جیتے ہیں اربابِ ریا میرے بعد

(نسخۂ عرشی میں)

ممکن ہے غالب نے تعلّی کے طور پر یہ بات کہی ہو مگر اتفاق سے یہ خصوصیت حبیب تنویر پر ضرور صادق آتی ہے یعنی اس قسم کی نظر اور بصیرت مجھے ان کے ڈراموں کے کرداروں کے انتخاب میں نظر آئی۔ وہ پہلی ہی نظر میں اپنے کرداروں کی ظاہری اور باطنی خصوصیات اور صلاحیتوں تک پہنچ جاتے اور یہ ملکہ ان کے اندر بدرجہ اتم موجود ہے۔ چنانچہ مردم شناسی اور دروں بینی کی اس صفت کی بدولت ہی دو کردار'' چرنداس چور'' میں مدن لال (چور) اور'' شطرنج کے مہرے'' میں ستار صدیقی (مجاور) جیسے لاثانی کرداروں کا انتخاب عمل میں آسکا۔ یوں تو حبیب کے تمام ڈرامے قابلِ داد و ستائش ہیں مگر عام طور پر '' آگرہ بازار'' اور'' چرنداس چور'' ان کی پہچان بن چکے ہیں۔

غرض یہ کہ حبیب تنویر کی شخصیت کے تمام صحت مند اور خوشگوار عناصر کی جھلک اور اثرات ہم ان کے ڈراموں میں بھی دیکھ سکتے ہیں۔ کوئی بھی فن ہو اس میں شخصیت کا رول ہونا ضروری ہے۔ اچھے اور بڑے فنکاروں کی طبیعت میں مشکل پسندی کا رجحان ان کی فطری افتاد کا نتیجہ ہوتا ہے۔ حبیب کے یہاں بھی یہ رجحان غالباً شروع سے ہی رہا ہے۔ شاید اسی افتادِ فطرت کی بنا پر انھیں سب سے مشکل فن فنِ ڈراما پسند آیا اور انھوں نے اس میں کچھ کر گزرنے کی ٹھان لی۔ چنانچہ اپنی دوسری شعری اور ادبی صلاحیتوں سے بے نیاز ہوکر اسٹیج کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنالیا۔ اس جان لیوا فن کے انتخاب میں حبیب نے اپنی تمام Geniousness کے تقاضوں کے تحت اپنے ڈراموں کو نئی سمت، نئی ہیئت، نئی تکنیک اور نئے موضوعات Contents سے سجا کر مشاہدین کو نئی زندگی، نئی فضا اور ایک نئے پیغام سے آشنا کیا، یہ بڑی بات ہے۔

حبیب تنویر یاروں کے یار، ایک شائستہ، مہذب اور خود دار عظیم فنکار ہیں۔ شاید اسی لیے بے جا انانیت اور خوشامد ان کا مزاج یا کردار نہ بن سکے اور بلاشبہ انھوں نے زندگی اور کائنات کے بارِ گراں کو ایک حساس اور باوقار آدمی کی طرح جیسے جیسے اور جس توازن سے جھیلا وہ ایک عظیم شخصیت اور نہایت محترم انسان ہی کی شان ہے، ایسی برگزیدہ شخصیتیں اور ان کے آفاقی تصورات، ذاتی کوائف اور احساسات و جذبات کا صحیح طور پر احاطہ کرنا بڑا دشوار امر ہے۔ کچھ اسی قسم کی دشواری سے مجھے بھی اس وقت گزرنا پڑا ہے۔ میں بہرحال ایک حقیر فقیر بے توقیر بھی حبیب تنویر کے لیے سردست اتنا ہی کہنے پر اکتفا کرتا ہوں کہ:

دیکھے یوسف بھی حسینانِ جہاں بھی دیکھے
تجھ سا محبوب طرح دار نہ دیکھا نہ سنا

□□□

پتہ:
B-1152, Indira Nagar, Lucknow-16

ڈیوڈ کاپر فیلڈ (جلد اوّل)

مصنف: چارلس ڈکنس/ مترجم: فضلِ حسنین

چارلس ڈکنس کی تحریر کی دلربائی اور اس کے اسلوب کی رعنائی کو اپنے ترجمے میں کشید کرنے میں فاضل مترجم نے کتنا وقت صرف کیا ہوگا اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ اس ترجمے کی ہر سطر میں پھولوں کی وہی خوشبو بسی ہوئی ہے جس سے چارلس ڈکنس کی انشا پردازی کا چمنستان مہکتا تھا۔

اسے ترجمہ نہیں، اصل ناول کا عکسِ جمیل کہنا زیادہ مناسب ہوگا۔

ڈیڑھ سو برس قبل انگریزی میں لکھے گئے اس شہرۂ آفاق ناول کا پہلی مرتبہ اردو ترجمہ پیش کرنے کا شرف'' قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان'' کو حاصل ہے۔

صفحات: 516، قیمت: -/256 روپے

نوٹ: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان،نئی دہلی کی جانب سے طلبہ اور اساتذہ کے لیے بالترتیب 45% اور 40% کی خصوصی رعایت دی جاتی ہے۔ تاجران کتب کو قومی اردو کونسل کے ضوابط کے مطابق رعایت دستیاب ہے۔ ادارہ

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، شعبۂ فروخت: ویسٹ بلاک-8، ونگ-7، آر۔ کے۔ پورم، نئی دہلی-110066

عبداللہ امتیاز احمد

گیان پیٹھ انعام پانے والی اردو شخصیات

بھارتی گیان پیٹھ کا قیام 1944 میں عمل میں آیا۔ اتر پردیش کے مشہور تاجر شاہو شانتی پرساد جین اور ان کی اہلیہ رما جین نے اس ادارے کے قیام میں اہم کردار ادا کیا جس کا مقصد مختلف زبانوں کے ادیبوں کی خدمات اور کارناموں سے دوسری زبانوں کے لوگوں کو روشناس کراتا ہے۔

بھارتی گیان پیٹھ ادارہ 1965 سے مسلسل سرگرم ہے اور اس نے علاقائی سطح سے لے کر ملکی سطح تک کی زبانوں کے کئی ادیبوں کی قدر افزائی کی ہے۔ یہ ملک کا ایک باوقار ادارہ ہے جو ادبی خدمات کے لیے ادیبوں کو انعامات دیتا ہے۔ اس ادارے کے انتخاب کا طریقۂ کار اگرچہ جمہوری ہے لیکن جب یہ کسی شخصیت کا انتخاب اس انعام کے لیے کرتا ہے اس کے ادبی کام کا بہت گہرائی اور گیرائی سے مطالعہ کیا جاتا ہے اور اس عمل کو کئی مراحل سے گزرنا پڑتا ہے۔ تب جا کر انتخاب عمل میں آتا ہے اور پھر وہ شخصیت اس انعام سے سرفراز ہوتی ہے۔

اس ادارے نے کم و بیش ہر زبان کے ادیبوں کو انعام سے نوازا ہے جس سے اس ادارے کی لسانی غیر جانبداری کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ آج تک اس ادارے کے ذریعے انتخاب کردہ شخصیت پر کسی نے انگلی اٹھانے کی جرأت نہیں کی اور پوری ادبی دنیا نے منتخب شخصیت کی اہمیت کو تسلیم کیا۔ یہ انعام حاصل کرنے والے چند ادیبوں کے نام اس طرح ہیں: گووند شنکر کروپ (ملیالم) 1965، تاراشنکر بندھو پادھیائے (بنگالی) 1966، اوماشنکر جوشی (گجراتی) 1967، سمترا نندن پنت (ہندی) 1968 وشوناتھ ستیہ نرائن (تیلگو) 1970، گوپی ناتھ موہنتی (اڑیا) 1973، امرتا پریتم (پنجابی) 1981، وناٹک کرشن گوکک (کنڑ) 1990، اندرا گوسوامی (آسامی) 2000 اور وِندا کارندکر (مراٹھی) 2003 وغیرہ۔

جہاں تک اردو ادب کا تعلق ہے بھارتی گیان پیٹھ نے اردو ادب کی تین شخصیات کو اس انعام سے سرفراز کیا ہے، وہ تین عظیم شخصیتیں فراق گورکھپوری، قرۃ العین حیدر اور علی سردار جعفری کی ہیں جو اردو ادب میں سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہیں۔ فراق گورکھپوری کا انتخاب اس انعام کے لیے سب سے پہلے کیا گیا اور 1969 میں بھارتی گیان پیٹھ نے ان کی خدمات اور کارناموں کے اعتراف میں انھیں اس انعام سے سرفراز کیا۔ اگر بیسویں صدی کی اردو شاعری کا احاطہ کیا جائے تو اس میں اقبال اور جوش کے علاوہ جن شاعروں کی آوازیں نمایاں ہیں ان میں ایک اہم نام فراق کا بھی ہے۔ فراق کے خیالات کا مرکز انسان اور انسانیت ہے۔ فراق نے اپنی شاعری کے آغاز میں کلاسیکیت کو اپنایا اور غزل میں قدیم اساتذہ کی پیروی کی اور انھی کے طرز بیان کو اپنایا مگر وقت کے ساتھ فراق کا فن نکھرتا گیا اور وہ خوب سے خوب تر کی طرف بڑھتے رہے۔ اس اعتبار سے وہ اپنے ہمعصروں میں نئی غزل کے پیش رو نظر آتے ہیں۔ انھوں نے جمالیات کے سانچے میں ڈھال کر حیات و کائنات کے مسائل کو پیش کیا ہے۔ فراق کے لہجے میں نرمی اور آہستہ روی اور بیان میں صداقت واضح طور پر دکھائی دیتی ہے وہ خواب و خیال کے بجائے اپنے محسوسات کو پیش کرتے ہیں۔

فراق کو ہندوستانیت سے گہرا لگاؤ ہے اور قومی زندگی کی عکاسی ان کا نصب العین ہے لیکن آفاقی قدروں سے بھی بیگانہ نہیں ہیں۔ فراق کی شاعری میں ہندی الفاظ کے برمحل استعمال کی وجہ سے سادگی کا حسن دوبالا ہوگیا ہے فراق ایک ایسے شاعر ہیں جن کی شاعری پر ہندو اساطیر کا گہرا اثر پایا جاتا ہے۔ اور جس میں ہندوستانیت کی روح جلوہ گر نظر آتی ہے۔ ان کی نظمیں ہندوستانی تہذیب و تمدن کا ورثہ ہیں۔ تشبیہ و استعارے کا انتخاب وہ ہندوستانی ماحول سے کرتے ہیں ان پر جنسی بے راہروی کے الزامات لگائے گئے لیکن وہ جنس کو انسانی زندگی کا ناگزیر حصہ سمجھتے ہیں اور اس کی پاکیزگی کے قائل ہیں۔

فراق کی غزلیں اردو شاعری کا گراں قدر سرمایہ ہیں۔ ان کی غزلوں میں نغمگی، ترنم اور موسیقیت پائی جاتی ہے۔ انھوں نے کئی شعری مجموعے اور کتابیں یادگار چھوڑی ہیں۔ مثلاً گل نغمہ، گل بانگ، چراغاں، دھرتی کی کروٹ، شعلہ ساز، مشعل، شعرستان اور رباعیوں کا مجموعہ ''روپ'' وغیرہ۔ ''اندازے'' اور ''اردو کی عشقیہ شاعری'' ان کی نثری تصانیف ہیں۔ ان کے ہمعصر جوش نے فراق کو ان الفاظ میں خراج عقیدت پیش کیا ہے۔

''جو شخص فراق جیسی عظیم شخصیت کی عظمت کو تسلیم نہ کرے وہ کور مادرزاد ہے۔''

اردو کی دوسری گیان پیٹھ انعام پانے والی شخصیت قرۃ العین حیدر ہیں۔ قرۃ العین حیدر کو 1989 میں اس انعام سے نوازا گیا۔ ان کی ادبی خدمات کا دائرہ بے حد وسیع ہے۔ انھوں نے ناول، افسانہ، ترجمہ اور صحافت کے میدان میں گراں قدر خدمات انجام دی ہیں۔ مگر ان کی شہرت کا اصل سبب ان کے ناول ہیں۔ ساتھ ہی ان کے افسانوں کی اہمیت بھی مسلم ہے۔ قرۃ العین حیدر بحث کا موضوع اس وقت بنیں جب 1959 میں ان کا ناول ''آگ کا دریا'' منظر عام پر آیا۔ ہندو پاک دونوں جگہ یہ ناول موضوع بحث رہا۔ اس کے لیے پاکستان کے سب سے بڑے ادبی انعام آدم جی پرائز کی سفارش کی گئی، مگر یہ انعام شوکت صدیقی کے ناول ''خدا کی بستی'' کو دیا گیا۔ ''آگ کا دریا'' میں ''قرۃ العین حیدر نے ہندوستان کی قدیم تاریخ کو پیش کیا ہے اور تاریخ اور فلسفے پر سیر حاصل بحثیں کی ہیں۔ اس ناول کی مقبولیت میں مصنفہ کی فلسفیانہ فکر، تاریخی واقفیت اور ان کے فنی اسلوب کا اہم حصہ رہا ہے۔

قرۃ العین حیدر کے دوسرے ناولوں میں اودھ کی تہذیب کے خاتمے،

گزرتے ہوئے وقت کے زیر اثر بدلتے ہوئے حالات، تقسیم ہند کے پیدا کردہ سیاسی، سماجی، معاشی اور اقتصادی مسائل، ہجرت، نقل مکانی، مغربی تہذیب کے دباؤ اور ہندوستانی مسلم نوجوانوں کے ذہنی انتشار کو موضوع بنایا گیا ہے۔ ان کے دونوں ابتدائی ناولوں ''میرے بھی صنم خانے'' اور ''سفینۂ غم دل'' کا موضوع تقریباً ایک ہی۔'' آگ کا دریا'' ان سے مختلف نظر آتا ہے مگر وقت کے گزرنے کا شدید احساس یہاں بھی موجود ہے۔ ان کے ناولوں میں اودھ کے نوابین، روسا، امرا اور شرفا کو خاص مقام حاصل ہے۔ انھوں نے مہاجرانہ زندگی اور ان کے مسائل کی خوبصورت عکاسی کی ہے جس کا شکار مصنفہ خود بھی تھیں۔ مغربی تہذیب کے مضر اثرات کا مسلم نوجوان لڑکے لڑکیوں پر کیا اثر مرتب ہو رہا ہے اس کی بھی واضح نشاندہی انھوں نے کی ہے۔ قرۃ العین حیدر موضوع کے ساتھ ساتھ اپنی تکنیک کی وجہ سے بھی موضوع بحث بنی رہیں۔ ان کی تکنیک اور اسلوب کی وجہ سے انھیں اردو ادب کی ورجنا دولف کہا جاتا ہے۔ ان کے ناولوں میں شعور کی رو پر سب سے زیادہ بحثیں ہوئی ہیں۔ شعور کی رو کی تکنیک کو سب سے پہلے سجاد ظہیر نے اپنے ناولٹ ''لندن کی ایک رات'' کے ذریعے اردو ادب میں متعارف کرایا جسے بعد میں قرۃ العین حیدر نے عروج بخشا۔ یہ تکنیک دراصل فرائڈ کو جاننے کے لیے تحلیل نفسی پر زور دیا ہے۔ اس تکنیک کے ذریعے ناول نگار کرداروں کے اندر جھانکنے کی کوشش کرتا ہے اور اس کے لیے خود کلامی کا سہارا لینا پڑتا ہے۔ قرۃ العین حیدر نے اس تکنیک کا اپنے ناولوں میں خوبصورت استعمال کیا ہے اور حسب ضرورت فلیش بیک تکنیک کا بھی استعمال کیا ہے۔

قرۃ العین حیدر کی ادبی خدمات کا جائزہ لیتے ہوئے ان کے افسانوں کا ذکر نہ کیا جائے تو ان کے ادب کا ایک اہم گوشہ تاریکی میں رہ جائے گا۔ ان کے افسانوں کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ عورتوں کی شخصیت اور سماج میں ان کی حیثیت ان کے افسانوں کا خاص موضوع رہا ہے۔ انھوں نے عورتوں کی زندگی کے ہر پہلو پر نگاہ کی ہے۔ دوسری طرف مسلم گھرانوں کے لڑکے لڑکیوں کی جذباتی زندگی کو بھی انھوں نے اپنے افسانوں کا موضوع بنایا ہے اور ان کے خیالات اور احساسات کی خوبصورت عکاسی کی ہے۔ انھوں نے جنس کو بھی موضوع بنایا ہے مگر ان پر کبھی عریانی یا فحاشی کا الزام عائد نہیں ہوا۔ انھوں نے مغربی اور مشرقی زندگی کے امتیازات اور حالات حاضرہ کے مختلف پہلوؤں کو اپنے افسانوں میں جگہ دی ہے اور ملکی اور غیر ملکی حادثات کی دل سوز تصویریں پیش کی ہیں جس سے ہمیں یہ اندازہ ہوتا ہے کہ قرۃ العین حیدر اپنے عہد سے کتنی باخبر تھیں اور ان کو انسان اور انسانیت سے کتنا گہرا لگاؤ تھا۔

قرۃ العین حیدر نے ناولٹ بھی لکھے ہیں اور ان کے سفرنامے بھی اردو ادب میں اہمیت کے حامل ہیں۔ ان کا خوبصورت اسلوب سفرنامے کو دلکش بنا دیتا ہے۔ قاری ان سفرناموں کے مطالعے کے وقت محسوس کرتا ہے کہ خود بھی شریک سفر ہے۔ قرۃ العین حیدر نے بچوں کے لیے بھی بہت سی کہانیاں لکھیں اور کئی غیر ملکی کہانیوں کا اردو میں ترجمہ کیا جس میں ترجمہ نگاری کی تمام خوبیاں موجود ہیں۔ قرۃ العین حیدر کی زندگی کا ایک اہم حصہ صحافت بھی ہے۔ ان کی ادبی زندگی کی شروعات صحافت سے ہوئی مگر مقبولیت ناولوں کی وجہ سے ملی۔ انھوں نے ممبئی سے ''امپرنٹ'' نام کا رسالہ جاری کیا اور کئی اخبارات اور رسائل سے وابستہ رہیں۔

اردو ادب کی تیسری بڑی شخصیت جسے گیان پیٹھ انعام حاصل ہوا وہ ہیں علی سردار جعفری، جنھوں نے نثری اور شعری دونوں اصناف میں نمایاں خدمات انجام دی ہیں۔ انھوں نے اپنی ادبی زندگی کی شروعات افسانہ نگاری سے کی تھی مگر بہت جلد افسانے سے منہ موڑ کر نظم کی طرف متوجہ ہوئے۔ وقتاً فوقتاً نثر بھی لکھتے رہے مگر ان کی ادبی شہرت میں ان کی نظموں کا اہم کردار رہا۔ خصوصاً آزاد نظم کہنے میں ان کو مہارت حاصل تھی۔ آزاد نظم کو عروج بخشنے میں علی سردار جعفری کا نمایاں حصہ رہا ہے۔ ان کی نظموں کو دو حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ مختصر اور طویل نظمیں، جن میں ان کی طویل نظمیں بہت اہمیت کی حامل ہیں۔ علی سردار جعفری کے یہاں محبت کو کلیدی حیثیت حاصل ہے۔

علی سردار جعفری کے کچھ ڈرامے بھی لکھے۔ ''لکھنؤ کی پانچ راتیں'' ان کی ایک مشہور کتاب ہے جسے خود نوشت بھی کہا جاسکتا ہے۔ انھوں نے رپورتاژ بھی لکھے۔ ان کی نامکمل سوانح ''ستمبر میرا گہوارہ'' ہے۔ ان کے کئی تنقیدی مضامین اور کتابیں ان کی یاد دلاتی رہیں گی جن میں ترقی پسند تحریک پر لکھی گئی کتاب ''ترقی پسند ادب'' کو خاص مقام حاصل ہے۔ علی سردار جعفری ایک بہت اچھے مترجم بھی تھے۔ ان کی زندگی کا ایک اہم حصہ صحافت سے بھی منسلک رہا ہے۔

جدید اردو شاعری میں علی سردار جعفری کی شخصیت بہت اہمیت کی حامل ہے۔ انھوں نے ان کی شاعری میں روزمرہ کے مسائل اور جدوجہد، کشمکش حیات اور انسانی امنگوں کی بہترین عکاسی ملتی ہے۔ ان کی آزاد نظموں میں ان کا فن عروج پر نظر آتا ہے۔ ان کی مثنوی ''جمہور'' اور طویل نظم ''نئی دنیا کو سلام'' ایک خاص دور کی بہترین عکاسی کرتی ہیں۔ انھوں نے علامتوں کے پردے میں سماج پر گہرا طنز کیا ہے۔ جا بجا ان کے ہاں پیکر تراشی اور تجسیم کاری کے بہترین نمونے ملتے ہیں۔ ان کی نظموں میں انقلاب کو مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ وہ حق و باطل کی لڑائی عملی اور قلمی دونوں سطح پر لڑتے رہے۔

علی سردار جعفری بنیادی طور پر نظم کے شاعر ہیں مگر انھوں نے کچھ غزلیں بھی کہی ہیں۔ انقلاب، طبقاتی کشمکش، زیردستوں کی آزادی کی خواہش اور عوامی زندگی کے دیگر گوناگوں مسائل کا بیان ان کا خاص موضوع رہا ہے۔ ان کی غزلوں میں بھی سیاسی اور معاشی مسائل کی عکاسی دیکھنے کو ملتی ہے جس کی وجہ سے ان کی غزلوں کا لہجہ خطیبانہ ہو گیا ہے۔

علی سردار جعفری مختلف اخبارات اور رسائل سے وابستہ رہے۔ ان کی خدمات کے وسیع دائرے کو اس مختصر سے مضمون میں سمیٹنا مشکل ہے، مختصراً یہ کہا جاسکتا ہے کہ علی سردار جعفری کی شخصیت اس انعام کی پوری طرح مستحق تھی۔

□□□

(بہ شکریہ ہندوستانی زبان، ممبئی، اپریل۔ جون 2008)

محمد عبداللطیف

عظیم ہندوستانی سائنس داں: قدیم اور جدید

آج ہمارے چاروں جانب ایسی بے شمار چیزیں ہیں جن کا پہلے کوئی وجود نہیں تھا۔ مثلاً کیمرہ، ٹیلی ویژن، ریڈیو، سائیکل، بجلی، کار، ریل گاڑی، موبائل فون، کمپیوٹر اور ہوائی جہاز وغیرہ وغیرہ۔ کیا کبھی ہم نے سوچا ہے کہ یہ چیزیں کس طرح وجود میں آئیں اور کس نے بنائیں۔ درحقیقت زمین اور آسمان کے درمیان لاتعداد راز چھپے ہیں۔ ان تک پہنچنے کے لیے خدا نے ہمیں عقل جیسی عظیم نعمت سے نوازا ہے۔ انسان نے اسی عقل کے ذریعے نئی نئی ایجادات کیں اور انسانی زندگی کو ترقی کے راستے پر ڈالا۔ ان ایجادات میں سائنس کا بہت بڑا دخل ہے۔ سائنس دراصل علم کا وہ شعبہ ہے جس سے ہم کسی بھی چیز کو بہت گہرائی اور ایک ترتیب کے ساتھ سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں اور وہ لوگ جو یہ کوشش کرتے ہیں اور غور وفکر سے کام لیتے ہیں وہ سائنس داں کہلاتے ہیں۔

ہمارے ملک ہندوستان میں بہت سے سائنس داں پیدا ہوئے جنھوں نے کئی اہم ایجادات کیں۔ اگر ہم اپنی تاریخ پر ایک نظر ڈالیں تو ہمارے ملک میں زمانۂ قدیم یعنی تین ہزار سال قبل مسیح سے سائنس داں موجود ہیں۔ ہندوستان میں آریہ تقریباً دو ہزار سال قبل مسیح میں آئے۔ انھوں نے ریاضی، فلکیات اور طب میں بڑے کارنامے انجام دیے۔ موریہ، شاکا، کشنا اور گپتا دور کو ہندوستانی سائنس کا بہترین دور مانا جاتا ہے۔ ہم یہاں آپ سے چند اہم سائنس دانوں کا تعارف کراتے ہیں۔

1. سسرتا (Susruta): چھٹی صدی قبل مسیح میں اس نے علم جراحی (Surgery) پر کام کیا۔ موجودہ دور میں جو Caesarean operation کیا جاتا ہے اس پر سب سے پہلے انھوں نے ہی کام کیا تھا۔ انھوں نے جراحی 101 اقسام بیان کی ہیں۔

2. آریہ بھٹ: آریہ بھٹ کی پیدائش 476 میں کیرالہ میں ہوئی۔ نالندہ یونیورسٹی سے اعلیٰ تعلیم حاصل کی۔ زمین گول ہے اور اپنے محور پر گھومتی ہے جس سے رات کے بعد دن اور دن کے بعد رات کا معمول بنا رہتا ہے، یہ خیال انھی کی دین ہے۔ اس کے علاوہ انھوں نے ہی پہلی دفعہ یہ بتایا کہ سورج اور چاند گرہن کس طرح وقوع پذیر ہوتے ہیں۔ علم فلکیات پر ان کی مشہو رکتاب ''آریہ بھٹ سدھانتا'' موجود ہے۔

3. برہم گپتا: آپ کی پیدائش بھلا مالا (گجرات) میں 598 میں ہوئی۔ انھوں نے صفر (o) کے استعمال کا قاعدہ بتایا اور علم ریاضی کو بڑی ترقی دی۔ ''برہم سدھانتا'' ان کی مشہور کتاب ہے جس کا عربی ترجمہ ''سندھ ہند'' کے نام سے کیا گیا ہے۔

4. ناگارجنا: گجرات میں سومناتھ کے قریب ڈسے ہک نام کے مقام پر 931 میں پیدا ہوئے۔ ناگارجنا ایک بڑے کیمیاداں تھے۔ انھوں نے مرکری سے آب حیات اور دیگر چیزیں بنانے کے لیے معدنیات اور الکلی کے علاوہ جانوروں اور پودوں سے حاصل کردہ مواد کا استعمال کیا۔ جواہرات دھاتوں اور موتیوں کو گلانے کے لیے انھوں نے پودوں سے تیزاب تیار کیا تھا۔ انھوں نے دوسری دھات سے سونا بنانے کی تکنیک بھی ایجاد کی تھی۔ یہ تکنیک زیادہ کامیاب نہیں ہوسکی مگر اتنا ضرور ہوا کہ دھات سونے جیسی رنگت اور چمکیلی شے میں بدل جاتی تھی۔ ان کی کتابوں میں ''راس رتنا کارا''، ''اترا ہتنترا''؟ ''کائش پوتنترا''، ''یوگ سارا'' اور ''یوگ ساتک'' مشہور ہیں۔

5. بھاسکر: 1114 میں بیجاپور (کرناٹک) کے ایک چھوٹے سے علاقے میں آپ کی پیدائش ہوئی بھاسکر ایک بڑے ریاضی داں تھے۔ انھوں نے الجبرا میں بڑا نام کمایا۔ انھوں نے الجبرا کے مسائل کو حل کرنے کے لیے جو کلیہ پیش کیا تھا اسے ''چکروال'' کہا جاتا ہے۔ بھاسکر نے علم فلکیات میں جو اصول مرتب کیے ان کی مدد سے ماہرین فلکیات ستاروں کی رفتار کا صحیح صحیح اندازہ لگاتے تھے۔ علم فلکیات میں بھاسکر نے 69 سال کی عمر میں ایک کتاب ''کرن کوتوہالا'' لکھی۔ اس کتاب میں پیش کردہ اصولوں کی بنیاد پر ہی بعد میں کلینڈر تیار کیا گیا۔

6. جگدیش چندر بوس: آپ کی پیدائش میمن سنگھ (موجودہ بنگلہ دیش) میں 30 نومبر 1858 میں ہوئی۔ ابتدائی تعلیم سینٹ زیوئرس اسکول کولکاتا سے حاصل کی۔ کالج کی تعلیم حاصل کرنے کے لیے بیرون ملک چلے گئے، جہاں سے 1885 میں بی.ایس.سی. کی ڈگری حاصل کی۔ جگدیش چندر بوس ماہر حیاتیات (Bioligist) بھی تھے اور ماہر طبیعیات (physicist) بھی تھے۔ انھوں نے ہی پہلی دفعہ یہ نظریہ پیش کیا کہ پودے بھی انسانوں کی طرح جاندار ہیں۔ انھوں نے وائرلیس ٹیلی گرافی کی ایجاد کی اور اس سے کام کرنے کے طریقے کو مارکونی سے ایک سال قبل 1895 میں ہی بتا دیا تھا۔ جگدیش چندر بوس نے کئی سائنسی آلات بھی بنائے تھے جن میں سے ایک بہت اہم آلے کا نام Crescograph ہے جس سے پودوں کی نشوونما کی شرح

نامی جاتی ہے۔ ان کا انتقال 23 نومبر 1937 کو ہوا۔

7. پروفیسر سی وی رمن: آپ کی پیدائش 7 نومبر 1888 کو ترچناپلی، تمل ناڈو میں ہوئی۔ پروفیسر سی وی رمن پہلے ہندوستانی سائنس داں ہیں جنھیں 1930 میں نوبل انعام سے نوازا گیا۔ انھیں یہ انعام طبیعیات میں تحقیق کے لیے اسٹاک ہوم میں عطا کیا گیا تھا۔ برطانوی حکومت نے 1929 میں ''سر'' کے خطاب سے نوازا۔ اس کے علاوہ ہندوستان سرکار نے 1945 میں ''بھارت رتن'' اور 1957 میں روس (Russia) نے ''لینن ایوارڈ؟؟ سے انھیں سرفراز کیا۔ 1906 میں انھوں نے ایک تحقیقی مقالہ لکھا جس میں انھوں نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی تھی کہ جب روشنی ایک مستطیل جھری پر پڑتی ہے تو شعاعیں غیر متناسب تاریک اور روشن پٹیوں (Bands) میں منتشر ہوجاتی ہیں۔ رمن نے نوریات (Optics) کو اپنا تحقیقی میدان بنایا اور یہ تجربہ اس سلسلے کی پہلی کڑی تھا۔ بعد میں انھوں نے روشنی کے پھیلاؤ اور سمندر کے رنگ کے حوالے سے بہت اہم کام انجام دیے۔ پروفیسر رمن نے سمندر کے نیلے رنگ کے متعلق لارڈ ریلے (Lord Relay) کے خیال کی تردید کی اور بتایا کہ سمندر کا نیلا رنگ آسمان کے نیلے رنگ کا عکس نہیں ہے بلکہ روشنی جب پانی کے قطرات سے ٹکراتی ہے تو دوسرے رنگوں کے مقابلے میں نیلے رنگ کی شدت زیادہ ہوجاتی ہے اور سمندر کا پانی نیلا نظر آتا ہے۔ دراصل پانی کا رنگ اس حقیقت پر منحصر ہوتا ہے کہ کس حد تک روشنی پانی کی سطح سے منعکس ہوتی ہے۔

8. پروفیسر بیربل ساہنی: 16 نومبر 1891 کو مغربی پنجاب کے شاہ پور ضلع کے بھیرہ (موجودہ پاکستان کا حصہ) نامی مقام پر پیدا ہوئے۔ پروفیسر بیربل ساہنی بنیادی طور پر نباتیات (Botany) کے پروفیسر تھے۔ جنھوں نے نباتیات کے میدان میں نمایاں کارنامے انجام دیے۔ پروفیسر بیربل ساہنی نے رکازی نباتیات (Paleobotany) میں کافی اہم کام انجام دیے اور ہندوستان کے پودوں والی چٹانوں سے متعلق نئی معلومات فراہم کیں۔ نباتیات کے میدان میں کارہائے نمایاں انجام دینے کے لیے انھیں گولڈ میڈل سے نوازا گیا۔

9. ڈاکٹر شانتی سروپ بھٹناگر: ڈاکٹر بھٹناگر کی پیدائش 21 فروری 1874 کو ہوئی۔ بھٹناگر کا اصل کام مقناطیسی کیمیا (Magnetic Chemistry) اور ایملشن (Emulsion) پر تھا۔ اس کے علاوہ صنعتی کیمیائی تحقیق میں ان کی خدمات ہمیشہ یاد کی جاتی رہیں گی۔ انھوں نے بغیر بو کا موم بنایا، مٹی کے تیل کی صفائی پر کام کیا۔ خام پٹرولیم کے استعمال پر بھی کام کیا۔ ہندوستان میں کئی قومی تجربہ گاہوں کے قیام کے پیچھے ڈاکٹر بھٹناگر کی کوشش ہیں۔

10. ڈاکٹر سالم علی: ڈاکٹر سالم علی کا پورا نام سالم معین الدین عبدالعلی تھا۔ آپ 12 نومبر 1896 کو پیدا ہوئے۔ انھوں نے ہندوستان میں پرندوں پر تحقیق کی ابتدا کی اور اس سلسلے میں دلچسپ، حیرت انگیز، مفید اور معلوماتی انکشافات کیے۔ یہ تمام معلومات انھوں نے اپنی کتاب ''مری بک آف انڈین برڈس'' (The Book of Indian Birds) میں پیش کردی ہیں۔ ان کے اسی موضوع پر دیگر کتابیں یہ ہیں: ''دی برڈس آف کچھ (The Birds of Kutch)، ''انڈین ہل برڈس'' (Indian Hill Birds)، برڈس آف ٹریونکور اینڈ کوچین (Birds of travancore and Cochin) وغیرہ۔

11. ہومی جہانگیر بھابھا: بھابھا کی پیدائش 30 اکتوبر 1907 کو ہوئی۔ ایٹمی ریسرچ کے حوالے سے ہمارے ملک میں ان کا نام بہت اہم ہے۔ انھوں نے انڈین انسٹی ٹیوٹ آف سائنس، بنگلور میں کاسمک ریز (Cosmic Rays) یعنی وہ شعاعیں جو خلا سے زمین تک پہنچتی ہیں اور جنھیں کائناتی شعاعیں بھی کہا جاتا ہے، ان پر بہت اہم کام کیا، جس سے مادّہ (Matter) کے متعلق معلومات فراہم ہوئیں۔ بھابھا نے صنعت کار ٹاٹا کے ساتھ مل کر 1945 میں ''ٹاٹا انسٹی ٹیوٹ آف فنڈامنٹل ریسرچ'' (TIFR) قائم کیا، جس کا اہم مقصد یہ تھا کہ برقی توانائی پیدا کرنے کے لیے جو نیوکلیئر پلانٹ لگائے جائیں جن کے لیے ہمارے ملک کو بیرون ملک کے ماہرین پر انحصار نہ کرنا پڑے۔ علم طبیعیات میں بھابھا کی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے انھیں رائل سوسائٹی کا فیلو (Fellow) نامزد کیا گیا۔ 1948 میں ایٹمی انرجی کمیشن قائم کیا گیا تو بھابھا کو اس کا چیئرمین بنایا گیا۔

12. ڈاکٹر ہرگووند کھرانہ: جینس (Genes) پر تحقیق کے حوالے سے انھیں مقبولیت حاصل ہے۔ اس بڑی تحقیق کے پیچھے بہت سے سائنس دانوں کی محنت تھی مگر اس میں سب سے بڑا کردار ڈاکٹر ہرگووند کھرانہ نے ہی ادا کیا تھا۔ ان کی ٹیم نے امریکہ کے مساچوسٹس انسٹی ٹیوٹ آف ٹیکنالوجی میں قدرتی جین کی ہی طرح ایک جین بنائی تھی۔ 1968 میں ڈاکٹر کھرانہ کو میڈیسن کے لیے مارشل ڈبلیو نیرن برگ اور ربرٹ ڈبلیو ہو سے کے ساتھ نوبل انعام سے نوازا گیا۔

13. ڈاکٹر اے پی جے عبدالکلام: آپ کا پورا نام Avul Pakir Jainulabedeen Abdul Kalam ہے۔ 15 اکتوبر 1931 کو رامیشورم، تمل ناڈو میں آپ پیدا ہوئے۔ ڈاکٹر کلام کو ہندوستان کے میزائل پروگرام کا موجد کہا جاتا ہے۔ ان کی سائنسی خدمات کے پیش نظر کئی انعامات و اعزازات سے انھیں نوازا گیا۔ 1981 میں انھیں پدم بھوشن 1990 میں پدم وی بھوش اور 1977 میں بھارت رتن جیسے ایوارڈ پیش کیے گئے۔ ڈاکٹر کلام نے اسٹیٹ جوزف کالج، تروچی سے گریجویشن کیا۔ 57-1954 کے دوران

ایم آئی ٹی (MIT)، مدراس سے ایئروناٹیکل انجینئرنگ میں ڈی ایم آئی ٹی (DMIT) حاصل کی۔ 1957 میں ڈیفنس ریسرچ اینڈ ڈیولپمنٹ آرگنائزیشن (DRDO) جوائن کیا۔ ڈاکٹر کلام نے انڈین اسپیس ریسرچ آرگنائزیشن (ISRO) میں اپنی زندگی کے 19 بہترین سال گزارے۔ ISRO سے وابستہ ہوکر انھوں نے روہنی اسیارچہ سٹیلائٹ لانچ وہیکل SLVIII کی مدد سے پست زمینی محور (Low Earth Orbit) میں نصب کیا۔ ISRO میں 19 سال گزارنے کے بعد ڈاکٹر کلام پھر DRDO لوٹ آئے۔ یہیں انھوں نے میزائل پروگرام کے سربراہ رہتے ہوئے اگنی اور پرتھوی جیسے میزائیلوں کو کامیابی سے ہمکنار کیا۔ ڈاکٹر کلام کو 18 جولائی 2002 کو صدر جمہوریۂ ہند کے عہدے پر منتخب کیا گیا تھا۔ اس عہدے سے وہ 2007 میں سبک دوش ہوئے۔

□□□

H.No. 6-17,Deshmukh Street,Basavakakalyan,
Dist.: Bidar - 585327, Karnataka State

جدید
ہندی — اردو لغت (دو جلدوں میں)

(ہندی الفاظ کے معنی اردو اور دیوناگری رسم الخط میں)

مرتب: پروفیسر نصیر احمد خاں

(سابق چیئرپرسن، ہندوستانی زبانوں کا مرکز، جواہر لعل نہرو یونیورسٹی، نئی دہلی)

ٹیکنک اور ترتیب و تقسیم کے اعتبار سے ''جدید۔ ہندی اردو لغت'' اپنی نوعیت کی واحد لغت ہے جس میں قدیم و جدید ہندی کے الفاظ، ان کے تلفظات، مآخذ اور نحوی زمروں کے علاوہ معنی و مفہوم کو اردو اور دیوناگری دونوں رسم الخطوں میں تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔ ماہر لسانیات پروفیسر نصیر احمد خاں کی مرتب کردہ یہ لغت ایک مفید، کارآمد اور سنجیدہ تحقیق ہے جو اردو اور ہندی کے طلبہ کی بیشتر ضرورتوں کو پورا کرتی ہے۔

صفحات: 3383 (دونوں جلدیں)، قیمت -/1700 روپے (دونوں جلدیں)

اقبال کی کہانی (پانچواں ایڈیشن)

مصنف: جگن ناتھ آزاد

اقبال کو عالمی ادب کے منظرنامے میں اہم مقام حاصل ہے۔ شاعرانہ کمالات کے علاوہ ان میں شگفتہ مزاجی بھی غضب کی تھی۔ ان کی علمی اور ادبی بحثوں میں بڑے باریک نکتے اور بذلہ سنجی پائی جاتی ہے۔ اقبال کو اپنے ملک وقوم کے بچوں کے مستقبل سے والہانہ لگاؤ ہی تھا جس کے سبب انھوں نے بچوں کے لیے بہت سی خوب صورت نظمیں لکھیں۔ ماہر اقبالیات جگن ناتھ آزاد نے اقبال کی ہمہ گیر شخصیت کا جامع تعارف اس کتاب میں پیش کیا ہے۔

صفحات: 83، قیمت -/13 روپے

نوٹ: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان،نئی دھلی کی جانب سے طلبه اور اساتذہ کے لیے بالترتیب 45% اور 40% کی خصوصی رعایت دی جاتی ھے۔ تاجران کتب کو قومی اردو کونسل کے ضوابط کے مطابق رعایت دستیاب ھے۔ ادارہ

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، شعبۂ فروخت: ویسٹ بلاک-8، ونگ-7، آر.کے. پورم، نئی دہلی-110066

ارشاد عالم

اردو ناول، انٹرنیٹ اور متوقع قاری

انٹرنیٹ کو عام ہوئے ابھی بمشکل دو دہائیاں گزری ہیں اور اس کے متعلق طرح طرح کے سوالات اٹھائے جا رہے ہیں۔ ایک سوال یہ ہے کہ کیا نیٹ کے ذریعے طباعت و اشاعت کا کام انجام دیا جاسکتا ہے، نیز نیٹ پر پیش کیے جانے والے مواد کے حقوق کا تحفظ کس طرح ممکن ہے؟

یہاں میرا مقصد انٹرنیٹ پر اردو ناول کی نمائندگی کا ایک مختصر خاکہ پیش کرنا ہے اور ساتھ ہی اردو کے روز افزوں بڑھتے ہوئے قاری کی نشاندہی کرنی ہے۔ انٹرنیٹ پر اردو زبان و ادب اور خاص کر فکشن کی پیشکش نے بہت سی غلط فہمیاں دور کی ہیں۔

عام طور پر سمجھا جانے لگا تھا کہ اب اردو ادب کا قاری ناپید ہو چکا ہے۔ بس کچھ مخصوص علاقے (pockets) ہیں جہاں اردو کتابوں کی تھوڑی بہت کھپت ہوجاتی ہے۔ انٹرنیٹ نے اس خیال کو باطل ثابت کر دیا۔ اردو کی کوئی بھی اچھی سائٹ کھول لیں تو دیکھیں گے کہ روزانہ ہزاروں کی تعداد میں لوگ اس سائٹ کو دیکھتے اور پڑھتے ہیں۔ قارئین کی تعداد کے متعلق معلومات بھی ہر سائٹ پر دستیاب ہے۔ دوسری طرف کتابوں کے حوالے سے دیکھیں تو ہزاروں کی تعداد میں ایک ایک کتاب ڈاؤن لوڈ کی جارہی ہے۔ ناول سے متعلق میرے پاس جو معلومات ہیں اس کے مطابق سب سے زیادہ ڈاؤن لوڈ کی گئی کتابوں کی فہرست اس طرح ہے:

نام کتاب/ مصنف/ دیکھنے والوں کا شمار/ ڈاؤن لوڈ کا شمار/ تاریخ اشاعت

داستان مجاہد/نسیم حجازی/ 8409/ 5505/ 2006/1/26

پکار/سرفراز احمد راہی/ 11695/ پڑھنے کے لیے/2007/6/23

عشق کا قاف/ سرفراز احمد راہی/ 20496/ 13352/ 2007/6/16

عشق کا عین/علیم الحق حقی/ 9776/ پڑھنے کے لیے/2007/11/24

سوچ نگر کا مسافر/ ڈاکٹر صابر علی ہاشمی/ 8614/ 8556/ 2005/5/1

چنار کے آنسو/ طارق اسمٰعیل ساگر/ 5045/ پڑھنے کے لیے/ 07/10/21

تیر نگاہ/ ایم اسلم/ 11850/ 6768/ 2006/4/29

ٹائیں ٹائیں فش/گل نوخیز اختر/ 13657/ 14482/ 2005/5/1

جو چلے تو جاں سے گذر گئے/ ناپا ملک/ 17749/ پڑھنے کے لیے/ 07/6/2

وہ جو حرف حرف چراغ تھا/ نگہت بانو/ 15169/ 1173/ 2007/4/22

آخری چٹان/ نسیم حجازی/ 5377/ ای س ل/ 2006/9/12

سلطان اور خان/ اسلم راہی/ 4327/ 263/ 2007/3/9

کچھ افسانوی مجموعوں پر بھی نظر ڈالتے چلیں

کرشن چندر کے بہترین افسانے/ ادارہ/ 6824/ 6069/ 2007/5/12

اردو ادب کے مشہور افسانے/ اوّل/ 21983/ 20624/ 2005/3/20

اردو ادب کے مشہور افسانے/ دوم/ 9731/ 8778/ 2007/4/8

ابابیلیں لوٹ آئیں گی/ ترنم ریاض/ 9110/ 5077/ 2004/12/5

تیسرا ہاتھ/ سرور عالم راز/ 5534/ 5135/ 2006/2/6

ناول۔ غدی/ شموئل احمد/ 11060/ 9335/ 2007/8/13

لینڈ اسکیپ کے گھوڑے/ مشرف عالم ذوقی/ 4996/ 3117/ 2006/2/4

مرگ زار/ محمد حمید شاہد/ 5847/ 4551/ 2006/2/6

نئی صدی کا عذاب/ ایم مبین/ 7379/ 5058/ 2005/3/20

یہ اعداد و شمار ظاہر کرتے ہیں کہ آج بھی اردو قاری بڑی تعداد میں موجود ہیں۔

اردو میں طباعت و اشاعت ہر چند کہ کوئی مشکل مسئلہ نہیں لیکن مختلف اشاعتی اداروں کی اپنی پالیسیاں ہوتی ہیں۔ اپنی پالیسی کے تحت وہ ایک خاص موضوع یا چند مخصوص موضوعات پر ہی کتابیں شائع کرتے ہیں۔ لہٰذا بہت سے ادیب اپنی تخلیقات کی حسرت سے اس جہان سے گزر جاتے تھے۔ اب ایسے ادیبوں کے لیے انٹرنیٹ نے ایک بڑا پلیٹ فارم مہیا کر دیا ہے۔ یہاں کسی تگ و دو کی ضرورت نہیں ہوتی۔ اگر مواد ٹائپ کیا ہوا ہے تو کہیں بھی سائبر کیفے میں ایک گھنٹے کے لیے بیٹھ جائیں اپنی ایک سائٹ بنائیں اور اپنی تخلیقات منٹوں میں دنیا کے کونے کونے تک پہنچا دیں۔

اردو کے بہت سے ادیبوں نے اس سہولت کا فائدہ اٹھایا ہے۔ مثلاً (1) ایم مبین "ٹوٹی چھت کا مکان" (2) حیدر قریشی، مکمل سائٹ (3) اردو دوست (4) رفعت مرتضیٰ، گسٹ ورلڈ ڈاٹ کام (5) گل نوخیز اختر کا ٹاپ اردو ڈاٹ نیٹ وغیرہ۔ اس نئی ایجاد پر غالب کا یہ مصرعہ صادق آتا ہے:

"صلائے عام ہے یاران نکتہ داں کے لیے"

انٹرنیٹ پر اردو فکشن کی پیشکش کے بعد اس کے قارئین کا حلقہ وسیع تر ہوگیا ہے۔ عام طور پر جب ہم ادب کے قاری کی بات کرتے ہیں تو ہمارا متوقع

قاری وہ ہوتا ہے جو مخصوص اردو علاقوں کا باشندہ ہے، جہاں اردو کتب کی خرید و فروخت ہوتی ہے۔ ہمارے زیادہ تر اندازے معلوم علاقوں کے بارے میں ہوتے ہیں۔ مثلاً دلی والے دلّی کی بات کرتے ہیں، ممبئی والے ممبئی کی اور کلکتہ والے کلکتہ کی۔ اسی طرح بھوپال، حیدرآباد، عظیم آباد وعلیٰ ہٰذا القیاس۔ لیکن جب ہم انٹرنیٹ کے حوالے سے اردو ادب کے قاری کی بات کرتے ہیں تو ہمارا متوقع قاری کسی خاص علاقے تک محدود نہیں ہوتا۔ اس حوالے سے اردو ادب کا متوقع قاری بہار سے برلن اور جزیرہ ہائے انڈمان ونکوبار سے جزیرہ نما عرب تک پھیلا ہوا ہوتا ہے۔ اس طرح انٹرنیٹ نے نہ صرف اردو قارئین کا حلقہ وسیع کیا ہے بلکہ ادب کی پیشکش کے انداز میں بھی ندرت پیدا کی ہے۔ اردو فکشن اور بطور خاص اردو ناول کے حوالے سے میرے مشاہدے میں جو باتیں آئی ہیں وہ میں آپ کے سامنے رکھنا چاہوں گا۔

موضوعات کی رنگارنگی: آج انٹرنیٹ پر جو کچھ پیش کیا جارہا ہے اس میں قاری کی دلچسپی کا خاص خیال رکھا جارہا ہے۔ انٹرنیٹ پر لکھنے والے فکشن نگاروں کا متوقع قاری ایک عام آدمی ہے جو باہر سے تھکا ہارا لوٹا ہے۔ وہ ایک ایسی کہانی چاہتا ہے جو اسے ذہنی اختلال سے نجات دلادے، وہ انٹرنیٹ کھولتے وقت اگر چاہتا ہے کہ رومان کی دنیا کی سیر کرے تو اسے ویسا ہی مواد موجود ملے، وہ اگر چاہتا ہے کہ جاسوسی دنیا کی گتھیوں کو سلجھتا ہوا دیکھے تو اسے ویسا ہی فکشن ملے یا اگر وہ چاہتا ہے کہ اعلیٰ ادبی شاہکار کا مطالعہ کرے تو اسے حسب منشا کہانی دستیاب ہو۔

اشاعت: انٹرنیٹ پر فکشن پیش کرنے والے اداروں نے اس کا خاص خیال رکھا ہے۔ ہر سائٹ پر کتابوں کی فہرست کے ساتھ ساتھ اس کا قدیم و جدید ہونا اور اس کی مقبولیت کا شمار بھی درج ہوتا ہے۔ کسی بھی ویب سائٹ پر نیا کیا ہے اور پرانا کیا ہے؟ یہ آپ کو سائٹ کھولتے ہی معلوم ہوجائے گا۔

کتابت: نیٹ پر ناول کی صورت میں جو کچھ موجود ہے زیادہ تر ٹائپ کی ہوئی صورت میں ہے۔ اسکین کیے ہوئے کسی ناول تک ابھی میری رسائی نہیں ہوئی ہے، لیکن اردو میں بہت سا مواد اسکین کیا ہوا ملتا ہے اس لیے گمان غالب ہے کہ ناول بھی اسکین کی ہوئی صورت میں موجود ہوگا۔

خط: (Font) نیٹ پر چونکہ صفحات کی کوئی کمی نہیں لہٰذا وہ تمام ناول جو نیٹ ایڈیشن کے لیے لکھے گئے ہیں یا جن کی برقی نقل (Soft copy) استعمال کی گئی ہے ان میں خط نہایت واضح اور بڑا ہے۔ عام طور پر ان پیج پر ٹائپ کیے گئے ناولوں میں ''نوری نستعلیق'' خط کا استعمال ملتا ہے۔

شکل (format): نیٹ پر اردو کے صفحات زیادہ تر ان پیج کی تصویری شکل JPG, Bitmap, MPEG, Aerobat میں ہیں۔ جہاں تک ناولوں کی بات ہے تو زیادہ تر ناول ان پیج پر ٹائپ کرکے پی، ڈی، ایف، کی شکل میں ہیں۔ ایچ ٹی ایم ایل (HTML) کی شکل میں بھی اب اچھی تعداد میں ناول موجود ہیں۔ خصوصاً علامہ اقبال سائبر لائبریری پر تمام کتابیں اب اسی شکل میں آرہی ہیں۔ مائیکروسافٹ ورڈ 2000 (Microsoft Word) کی آمد کے بعد اب ورڈ میں اردو ٹائپ کرنا آسان ہوگیا ہے۔ لہٰذا اب کچھ اردو ناول ورڈ فائل میں بھی دستیاب ہیں۔ اس فائل کا فائدہ یہ ہے کہ اس فائل میں کبھی بھی بآسانی ترمیم کی جاسکتی ہے، یا پھر اگر اس کا پرنٹ لینا ہو تو اس کا خط چھوٹا یا بڑا کیا جاسکتا ہے۔ یونی کوڈ میں بھی ورڈ کی طرح ترمیم و اضافے کی گنجائش باقی رہتی ہے کچھ ناول اس شکل میں بھی دستیاب ہیں۔

یک سطری تعارف: یہاں کتاب کے ساتھ آپ کو اس کا یک سطری تعارف بھی نظر آئے گا۔ یہ خاص انٹرنیٹ کی دین ہے۔ مثلاً (mmobeen) سائٹ پر آپ دیکھیں گے کہ پہلے صفحے پر مجموعے کے تمام افسانوں کا عنوان تین زبانوں یعنی اردو دیوناگری اور انگریزی میں دیا گیا ہے۔ ساتھ ہی تمام افسانوں کا یک سطری تعارف بھی پیش کیا گیا ہے۔

ادیب کا تعارف: اس کے ساتھ ہی ہم دیکھتے ہیں کہ یہاں کتاب کے ساتھ ادیب یا مصنف کا تعارف ایک لازمی حصہ ہے۔ اردو کے مطبوعہ ادب میں مصنف کے تعارف کو اہمیت دی گئی ہے، اس سے انکار نہیں لیکن اردو ادب کا بڑا ذخیرہ ایسا ہے جس میں کتابوں پر مصنف کا تعارف نہیں ہے۔ انٹرنیٹ پر چونکہ صفحات کی کوئی کمی نہیں ہے اور یہاں اشاعت کے وہ مسائل بھی نہیں ہیں جن کی وجہ سے کتابوں کی ضخامت بوجھ بن جاتی ہے لہٰذا یہاں ہر ادب پارے کے ساتھ ادیب کا تعارف بھی موجود ملتا ہے۔

متن کی رسائی: اب قاری تک بنیادی متن کی رسائی کا مسئلہ بہت حد تک آسان ہوگیا ہے۔ یہاں ایک سوال اٹھتا ہے کہ کیا قاری ناول جیسی طویل تخلیق کو اسکرین پر پڑھ سکتا ہے، یا پھر یہ کہ اگر اس کو ڈاؤن لوڈ بھی کرلیا جائے تو کیا آج کے قاری کے پاس اتنا وقت ہے کہ ناول پڑھ سکے؟ یہ خیال خام بہت عام ہوگیا تھا لیکن ہیری پوٹر اور ''دیوتا'' جیسے طویل ناولوں نے ایک بار پھر یہ ثابت کردیا ہے کہ داستان، ناول یا افسانے کی طوالت اس کی قرأت میں کوئی رکاوٹ نہیں ڈالتی ہے۔ اصل مسئلہ ہے مواد کا۔ اگر مواد قابل مطالعہ ہوگا تو ناول ہو یا قصہ یا ادب کی کوئی اور صنف خواہ کتنی ہی طویل کیوں نہ ہو پڑھی جائے گی۔

انٹیلیکچوئل پراپرٹی کا مسئلہ: انٹرنیٹ کے حوالے سے یہ ایک بین الاقوامی مسئلہ بن کر سامنے آیا ہے۔ انٹرنیٹ پر اس کا خاص خیال رکھا جاتا ہے۔ اردو کے معاملے میں بھی انٹیلیکچوئل پراپرٹی کے وہی اصول مستعمل ہیں جو دیگر زبانوں کے لیے ہیں۔ کچھ معاملات میں ہمیں مغرب کا تتبع کرنے میں ہی

زیادہ آسانی رہتی ہے۔ انٹلیکچوئل پراپرٹی کا مسئلہ بھی کچھ اسی قسم کا ہے۔ اس ضمن میں ہم دیکھتے ہیں کہ وہ کتابیں جن کے مصنفین یا ناشرین کتاب کو کاروباری مقاصد کے لیے نیٹ پر مشتہر کرتے ہیں وہ کتابیں آپ ڈاؤن لوڈ نہیں کرسکتے۔ اس مقصد کے تحت نیٹ پر مختلف فارمیٹ موجود ہیں۔ بعض میں آپ کتاب کا کوئی بھی صفحہ ڈاؤن لوڈ نہیں کرسکتے۔ بعض میں ایک حد تک ڈاؤن لوڈ کرسکتے ہیں اور بعض جگہ باقاعدہ رکن بنے بغیر یا پھر قیمت ادا کیے بغیر آپ کتاب تک رسائی نہیں حاصل کرپاتے۔

قاری کے اثرات کی پذیرائی: انٹرنیٹ کے فائدوں میں سے ایک یہ بھی ہے کہ نیٹ پر قاری کو اپنے تاثرات پیش کرنے کی آزادی ہوتی ہے۔ ہر کتاب کے ساتھ کمنٹ یا تبصرے کے لیے بھی گوشہ موجود ہوتا ہے۔ اس طرح ناول یا فکشن کی تنقید میں نئے گوشے ابھر رہے ہیں جن سے قاری اساس تنقید کی جڑیں مضبوط ہوں گی۔

انٹرنیٹ ایک جدید برقی رسالہ ہے۔ اس کی رسائی لامحدود ہے۔ یہ آسان اور کم خرچ پر ترویج واشاعت کا ایک ذریعہ ہے۔ اس کی دنیا بہت وسیع ہے اور خاص بات یہ کہ نئی نسل اس سے آشنا ہے۔ نیٹ کی وجہ سے اردو ناول کے قارئین کی تعداد میں خاطر خواہ اضافہ ہوا ہے اور انشاء اللہ مستقبل میں اور بھی اضافہ ہوگا لیکن اس کے لیے ضروری ہے کہ اردو ناول کو انٹرنیٹ پر عام کیا جائے۔

کتاب کی بجائے نیٹ کیوں؟ کتاب پڑھنا یقیناً نیٹ کے مقابلے میں زیادہ آسان ہے لیکن آج جب دنیا ایک گلوبل ولیج بن گئی ہے، ہم ساری دنیا کی کتابوں تک رسائی نیٹ کے ذریعے ہی حاصل کرسکتے ہیں۔ کون سی کتاب بازار میں دستیاب ہے اور کون سی نہیں، کچھ دنوں میں ہمیں یہ معلومات بھی انٹرنیٹ کے ذریعے حاصل ہوگی۔ ریلوے ریزرویشن کی مثال ہم لوگوں کے سامنے ہے۔ انٹرنیٹ سے بک کیے گئے ٹکٹ پر خرچ بھی زیادہ آتا ہے اور ذمے داری بھی زیادہ بڑھ جاتی ہے پھر بھی ہم دیکھ رہے ہیں کہ انٹرنیٹ سے بکنگ کا چلن روز بروز عام ہوتا جارہا ہے۔

حواشی:

alqamaronline.net
loveurdu.com
jasoosidunya.com
urducd.htm
urdumarkaz.com
urdupoint.com
pakiurdu.com
jadidadab.com
topurdu.com
kitabghar.com

□□□

پتہ:
29-Old Brahmaputra Hostel,
JNU, New Delhi-110067

تنقیدی اور تہذیبی مطالعے

مصنف: طاہرہ پروین

اس کتاب میں اردو شعر و ادب اور خصوصاً نظیر، انیس، اقبال اور رشید جہاں کے حوالے سے ان کی تخلیقات میں مذہبی و تہذیبی امور پر پندرہ مضامین شامل ہیں جن میں مصنفہ نے مذکورہ قلم کاروں کی تخلیقات کو سمجھنے کے لیے لفظیات کی تدریس اور عملی تنقید کا بھی سہارا لیا ہے۔

صفحات: 191، قیمت: -/93 روپے

تاریخ تعلیم ہند

مصنف: سیّد نور اللہ/ جے. پی. نائک

مترجم: مسعود الحق

اس کتاب میں 1765 سے 1947 تک ہندوستان میں عہد بہ عہد ہونے والی تعلیمی تبدیلیوں کا مجمل خاکہ پیش کیا گیا ہے۔ جدید تعلیمی تاریخ کی ہر اہم منزل پر ایک مکمل اور جامع تبصرہ کرنے، ہر اہم فیصلے کے پیچھے کارفرما اسباب اور ان کے اثرات کو سمجھانے اور یہ دکھانے کی کوشش کی گئی ہے کہ موجودہ نظام تعلیم کس طرح وجود میں آیا ساتھ ہی یہ بھی دکھانے کی کوشش کی گئی ہے کہ یہ تعلیمی اقدام صرف حال ہی کے سمجھنے میں معاون نہ ہو بلکہ مستقبل کی اصلاحات اور تنظیم نو کے رخ کی بھی نشان دہی کرے۔

صفحات: 552، قیمت: -/111 روپے

قومی اردو کونسل کی اہم مطبوعات

قدیم ہندوستان کی ثقافت وتہذیب تاریخی پس منظر میں

مصنف: ڈی.ڈی.کوسمبی/ مترجم: بالمکند عرش ملسیانی

ہندوستان کی تہذیب وثقافت دنیا کی چند قدیم تہذیبوں اور ثقافتوں میں سے ایک ہے۔مشہور مورخ ڈی.ڈی.کوسمبی نے اس کتاب میں ہندوستانی تہذیب وثقافت کے سرچشموں کی نشاندہی کے علاوہ اس کی بالیدگی وترقی کا تحقیقی جائزہ پیش کیا ہے۔ ماقبل تاریخ عہد کی ثقافت، آریوں کی آمد اور مگدھ سلطنت کو خصوصیت سے موضوع بحث بنایا گیا ہے۔

صفحات: 319، قیمت -/73 روپے

شیر شاہ اور اس کا عہد

مصنف: کالکارنجن قانون گو/ مترجم: رام آشرے شرما

شیر شاہ دنیا کی ان بڑی ہستیوں میں سے ایک ہے جن کے ساتھ تاریخ نے انصاف نہیں کیا ہے۔ اس کی سب سے اہم وجہ غالباً یہ رہی کہ شیر شاہ کی وفات کے دس سال کے اندر اس کا خاندان نیست ونابود ہو گیا اور زمام اقتدار پھر مغلوں کے ہاتھ میں آگئی جنھیں شیر شاہ سے کوئی ہمدردی نہ تھی۔ اس کتاب میں فارسی زبان کے جملہ دستیاب ماٴخذ اور دیگر ذرائع کی مدد سے حقائق تک پہنچنے کی کوشش کی گئی ہے۔

صفحات: 704، قیمت -/135 روپے

تاریخ جہانگیر

مصنف: ڈاکٹر بینی پرشاد/ مترجم: رحم علی الہاشمی

مغلیہ سلطنت کے چوتھے فرماں روا جہانگیر کے بارے میں لکھی گئی زیادہ تر کتابوں میں مغربی مورخین کی آرا سے استفادہ کیا گیا ہے جن کی صحت پر شک کی کافی گنجائشیں ہیں۔ اس کتاب میں پہلی مرتبہ توزک جہانگیری، اقبال نامہ اور دیگر فارسی تاریخوں، معاصر یورپیوں کے سفرناموں اور خطوط کی مدد سے جہانگیر کے عہد حکومت کے تمام اہم سیاسی اور فوجی کارناموں کا احاطہ کیا گیا ہے۔

صفحات: 365، قیمت -/90 روپے

تاریخ شاہجہاں

مصنف: ڈاکٹر بناری پرشاد سکسینہ/ مترجم: ڈاکٹر سید اعجاز حسین

شاہجہاں کا عہد حکومت ہندوستانی تاریخ کا ایک زرّیں باب سمجھا جاتا ہے۔ اس عہد میں ہر طرف امن چین اور خوش حالی تھی اور ہر طرف علم وہنر کی ترقی نظر آتی تھی۔ اسی عہد میں تاج محل، لال قلعہ اور جامع مسجد جیسے ہند مغل فن تعمیر کے بہترین نمونے بھی وجود میں آئے اور بڑے بڑے جنگی معرکے بھی سر ہوئے لیکن اسی عہد میں عظیم مغلیہ سلطنت کے زوال کے آثار بھی نمودار ہونا شروع ہو گئے تھے۔ ڈاکٹر بناری پرشاد سکسینہ نے ان تمام حقائق کا معروضی جائزہ پیش کیا ہے۔

صفحات: 446، قیمت -/109 روپے

جنوبی ہند کی تاریخ

مصنف: کے. اے. نیل کنٹھ شاستری/ مترجم: آر. کے. بھٹناگر

اس کتاب میں جنوبی ہندوستان کی قدیم تاریخ سے سترھویں صدی کے نصف تک کی مدت کا جائزہ پیش کیا گیا ہے جس میں جنوبی ہند کے جغرافیائی حالات، آریوں کا عروج، موریہ سلطنت، ستواہن، بہمنی اور وجے نگر سلطنتیں اور ان کا ادب، آرٹ، مذہب اور فلسفہ وغیرہ زیر بحث آئے ہیں۔

صفحات: 567، قیمت -/114 روپے

علی وردی اور اس کا عہد

مصنف: کالی کنکر دتا/ مترجم: عبدالاحد خاں خلیل

جب مغلیہ سلطنت کی بنیادیں کمزور ہوگئیں تو ملک کے مختلف علاقوں میں خود مختار حکومتیں وجود میں آنے لگیں۔ بنگال میں علی وردی خاں نے 1740 میں اپنی حکومت قائم کی۔ اس کتاب میں علی وردی کے حالات زندگی، بنگال، بہار اور اڑیسہ پر اس کا قبضہ، مرہٹوں کے حملے، افغانوں کی بغاوت اور دیگر اہم واقعات کے ساتھ ساتھ اس عہد کی معاشی، معاشرتی اور سیاسی صورت حال پر بنیادی ماٴخذ کی مدد سے روشنی ڈالی گئی ہے۔

صفحات: 392، قیمت -/86 روپے

نوٹ: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دھلی کی جانب سے طلبہ اور اساتذہ کے لیے بالترتیب 45% اور 40% کی خصوصی رعایت دی جاتی ھے۔ تاجران کتب کو قومی اردو کونسل کے ضوابط کے مطابق رعایت دستیاب ھے۔

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک-8، ونگ-7، آر. کے. پورم، نئی دہلی-110066

محمد احتشام الحسن مجاہد

کمپیوٹر نیٹ ورکنگ شعبے میں روزگار کے مواقع

کمپیوٹر نیٹ ورکنگ میں ملازمتوں کے مواقع کے متعلق جب عالمی نوعیت کو چند بڑی ویب سائٹ پر تفصیلات جمع کرنے کی کوشش کی تو یہاں ملنے والی تفصیلات نے مجھے نہ صرف حیرت زدہ کردیا بلکہ خوشی بھی ہوئی کہ ہماری نوجوان نسل جس شعبے میں اپنا کیریئر بنانے کا منصوبہ تیار کررہی ہے اس شعبے کے اگلے کم از کم 5 تا 10 برس نہایت ہی تابناک ہیں۔ Cisco کی ویب سائٹ پر Discover New Career Opportunities کے تحت جو اہم معلومات فراہم ہوئیں ان کے مطابق کمپیوٹر ورک کی عالمی مارکیٹ میں 2014 تک 40 فیصد اضافہ درج کیا جائے گا جبکہ ترقی پذیر ممالک میں۔ یہ 30 فیصد ریکارڈ کیا گیا ہے۔ یوروپین یونین کی مارکیٹ میں رواں سال میں 350,000 ملازمتیں دستیاب رہیں گی۔ امریکی کمپیوٹر نیٹ ورک میدان میں 2014 تک ایک ملین ملازمتیں دستیاب ہوں گی۔ ایشیائی ممالک میں 2009 تک 396000 تک نیٹ ورک ماہرین کی ضرورت ہوگی۔ کمپیوٹر نیٹ ورکنگ شعبے میں اپنا کیریئر بنانے کے لیے محنت کرنے والے افراد کے لیے سب سے بڑی خوش خبری یہ ہے کہ کمپیوٹر نیٹ ورکنگ شعبے میں تیزی سے ترقی کرنے والی مارکیٹوں کی فہرست میں ہندوستان، ترکی، روس اور میکسیکو کے نام سب سے اوپر ہیں۔

لیکن ان ملازمتوں کے حصول کے لیے ہماری تیاری کیا ہونی چاہیے؟ یہ اہم سوال ہے۔ ملازمتوں کی کمی نہیں لیکن صحیح رہبری اور رہنمائی کے فقدان نے ہمیں ان ملازمتوں کے حاصل کرنے میں کی جانے والی ثمر آور محنت سے ناآشنا رکھا ہے۔

آغاز کہاں سے؟: کمپیوٹر نیٹ ورکنگ شعبے میں موجود شاندار ملازمتوں کے حصول کے لیے آغاز کالج کی تعلیم سے ہی ہوتا ہے۔ ہم ایک بڑی غلط فہمی کا شکار ہیں۔ دیکھا گیا ہے کہ اکثر والدین یہ سوال کرتے ہیں کہ صاحب! ہمارا لڑکا/لڑکی انٹرمیڈیٹ کے ایک مضمون میں فیل ہوگیا ہے اور ہم چاہتے ہیں کہ وہ وقت ادھر ادھر برباد کرنے کے بجائے کمپیوٹر کا کوئی کورس کرلے، جس کے بعد وہ دوبارہ امتحان دیتے ہوئے اپنی تعلیم مکمل کرلے گا۔ یہ وہ ذہنیت ہے جو ہماری، صلاحیت نوجوان نسل کو صرف چھوٹی موٹی ملازمتوں پر اکتفا کرنے پر مجبور کررہی ہے۔ کمپیوٹر شعبہ ایک وسیع شعبہ ہے جہاں پرکشش ملازمتیں موجود ہیں لیکن اس کے لیے سب سے پہلے ''ڈگری'' کا ہونا لازم ہے اور ڈگری میں بی ٹیک، بی ای، بی ایس سی ہو تو زیادہ بہتر ہے۔ اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ بی اے اور بی کام کے طلبہ کے لیے کوئی موقع نہیں۔ بی اے اور بی کام کے طلبہ بھی کمپیوٹر نیٹ ورکنگ کے شعبے میں اور ملٹی نیشنل کمپنیوں میں ملازمتیں انجام دے رہے ہیں۔

کالج اور یونیورسٹی کی تعلیم کے بعد کمپیوٹر نیٹ ورکنگ شعبے میں دستیاب ڈگریوں کی مانگ کی جاتی ہے جن میں اہم اور قابل ذکر MCSE اور CCNA ہیں۔ تعلیمی ڈگری اور کمپیوٹر تعلیم کی ڈگری کے بعد جو اہم صلاحیت، جس کو اکثر طلبہ نظرانداز کرتے ہیں وہ انگریزی میں مہارت ہے۔ کمپیوٹر کے تکنیکی شعبے میں ملازمت کے امیدواروں میں جن صلاحیتوں کو لازم قرار دیا گیا ہے ان میں انگریزی پر عبور بھی ملی ہے۔ ''انگریزی پر عبور'' کے علاوہ جن صلاحیتوں کو ترجیح دی جارہی ہے ان میں امیدوار کی تحریری، تقریری، تجزیاتی اور تخلیقی صلاحیتیں اہم ہیں۔ کئی ہندوستانی یونیورسٹیوں نے اپنے نصاب میں انگریزی کا باضابطہ ایک کورس شامل کیا ہے جس کے تحت یونیورسٹی انتظامیہ طلبہ میں Reading, Speaking, Listening اور Writing صلاحیتوں کو فروغ دینا چاہتا ہے۔ متذکرہ اہم اور بنیادی شرائط کی تکمیل کے بعد یہ سوال ہنوز باقی رہ جاتا ہے کہ ہمارے پاس یونیورسٹی کی ڈگری ہے اور ہم انگریزی میں ماہر بھی ہیں لیکن کمپیوٹر میدان کی تیاری کا آغاز نہیں کیا۔ یعنی کمپیوٹر نیٹ ورکنگ شعبے میں کیریئر کے لیے آغاز کہاں سے کریں؟ کمپیوٹر نیٹ ورکنگ شعبے میں کیریئر کا آغاز دراصل کالج کی بنیادی تعلیم کے بعد ہوتا ہے۔ بنیادی شرط کمپیوٹر ہارڈ ویئر اور نیٹ ورکنگ کی بنیادی تعلیم ہے۔ کمپیوٹر ہارڈ ویئر اور نیٹ ورکنگ کے متعلق بھی کئی غلط فہمیاں رائج ہیں۔

سب سے پہلے یہ بات ذہن نشین کرلیں کہ کمپیوٹر نیٹ ورکنگ شعبے میں جہاں شاندار ملازمتوں کے مواقع دستیاب ہیں وہیں ان ملازمتوں کے حصول کے لیے صحیح منصوبہ بندی اور صبر و تحمل کے ساتھ اپنی ذات میں موجود خامیوں کو دور کرنے کی بھی ضرورت ہے۔ اکثر اخبارات میں اشتہارات پڑھنے کو ملتے ہیں جن میں 5500 یا 8500 کے پیکج میں ہارڈ ویئر، ورکنگ، ایم سی ایس ای، سی بی این اے، لائینکس اور سیکیوریٹی جیسے مضامین کو وہ بھی مختصر سے عرصے میں مکمل کرانے کے لیے کیے جاتے ہیں جو اپنی جگہ صحیح ہوں گے لیکن ان تیز رفتار کورسز میں داخلے کے لیے کیا آپ میں اتنی صلاحیت موجود ہے کہ آپ کم وقت میں اتنے مضامین پر عبور حاصل کرسکیں۔

کیریئر کی ابتدا: کمپیوٹر نیٹ ورکنگ شعبے میں کیریئر بنانے کے لیے ابتدا کمپیوٹر ہارڈ ویئر اور نیٹ ورکنگ سے ہوتی ہے۔ لیکن اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کمپیوٹر ہارڈ ویئر اور نیٹ ورکنگ میں کن مضامین میں مہارت ضروری ہے اور کن مضامین کو نظرانداز کیا جاسکتا ہے؟ کمپیوٹر ہارڈ ویئر کی تعلیم کے آغاز میں اس شعبے کی اصطلاحات (Terminology) سے واقفیت ضروری ہے۔ کیونکہ اس شعبے میں کئی ایسے الفاظ رائج ہیں جو کسی دوسرے شعبے میں موجود نہیں۔ لہٰذا اصطلاحات پر عبور اس شعبے میں ضروری ہے۔ اکثر طلبہ اس شعبے میں داخلے کے باوجود Terminology کو نظرانداز کرتے ہیں، حالانکہ ہر شعبے کے ماہرین اس بات پر زور دیتے ہیں کہ طلبہ کو چاہیے کہ وہ جس شعبے میں ماہر بننا چاہتے ہیں اس کی بنیادی

شرط اس شعبے کی اصطلاحات پر عبور ہے۔ اصطلاحات پر عبور حاصل کرنے کے لیے استاد کی مدد کے علاوہ متعلقہ مضامین کی کتابوں اور انٹرنیٹ سے استفادہ کیا جاسکتا ہے۔ Terminology کے بعد جن اہم اسباق پر عبور ضروری ہے۔ ان میں "Dos" سے متعلق اہم "Commonds" ہیں۔ ''ڈاس'' کے کمانڈس پر عبور اس لیے ضروری ہے کہ کمپیوٹر کے اکثر مسائل کے دوران کمانڈس کی ہی ضرورت پڑتی ہے۔ بعد ازاں کمپیوٹر ریام، ہارڈ ڈسک کے اقسام، پارٹیشنس اور فارمیٹنگ کے علاوہ سسٹم کی اسمبلنگ، اینٹی وائرس، اسکیننگ، ڈرائیورس انسٹالیشن، ڈیوائڈ منیجر کے علاوہ کمپیوٹر میں یکجا کیے جانے والے تمام آلات کی کارکردگی کا انداز اور ان سے متعلق عام نوعیت کے مسائل جن کو کمپیوٹر کی اصطلاح میں "Trouble Shooting" کہا جاتا ہے، سے واقفیت ضروری ہے۔ ہارڈ ویئر کے بعد دوسری منزل نیٹ ورکنگ کی ہوتی ہے اور یہاں جن اسباق کی تکمیل اور ان پر عبور ضروری ہے ان میں چند قابل ذکر اسباق مندرجۂ ذیل ہیں۔

(1) نیٹ ورک کی اہمیت و افادیت۔

(2) نیٹ ورک کے اقسام (W.A.N اور L.A.N)

(3) نیٹ ورک انفراسٹرکچر
(Peer to Peer or Domain Model)

(4) پروٹوکال (خصوصاً Tcp/IP)

(5) Tcp/IP کی کلاسیں DNS, DHCP وغیرہ کا انسٹالیشن اور کانفیگریشن کے ساتھ ٹربل شوٹنگ۔

(6) کلائنٹ اور سرور آپریٹنگ سسٹم کا انسٹالیشن، کانفیگریشن اور ٹربل شوٹنگ۔

(7) کریمپنگ (نیٹ ورک کیبل تیار کرنے کے مختلف طریقے)

(8) سسٹم ایڈمنسٹریشن میں یوزرس اور گروپس کی تیاری، کلائنٹ کا سرور سے جوڑنا اور مختلف کلائنٹ پر مختلف تحدیدات اور اختیارات فراہم کرنا۔ اس کے علاوہ نیٹ ورک آلات جن میں Swich, Hub اور Router قابل ذکر ہیں، ان کے متعلق بنیادی اور اہم معلومات کے ساتھ ان امور کی انجام دہی کے ضروری نکات شامل ہیں۔

متذکرہ بالا چند اہم نکات کو بعض افراد "MCSE" سے جوڑتے ہیں حالانکہ یہ نکات (اسباق) نیٹ ورکنگ کی بنیادی شرائط کی تکمیل کے لیے انتہائی ضروری ہیں اور اکثر MNC's میں انہی اسباق کے متعلق انٹرویو میں سوالات کیے جاتے ہیں۔ نیٹ ورکنگ کے ان اسباق میں بھی Tcp/IP کا گہرائی سے مطالعہ مستقبل میں سرٹیفکیشن کورسز میں کافی سودمند ثابت ہوتا ہے۔ بنیادی تعلیم ہارڈ ویئر اور نیٹ ورکنگ کی تکمیل کے بعد MCSE اور CCNA کی طرف اگلا قدم بڑھائیں۔ MCSE کے متعلق چند اہم باتیں ذہن نشین کرلیں کہ MCSE کی تعلیم تو حاصل کرلیں لیکن جب تک MCSE کے تمام امتحانات کو کامیاب کرنے کی اشد ضرورت نہ پڑے، جب تک اپنے پیسے کو برباد نہ کریں۔

ہندوستان کے مختلف میٹروشہروں میں بہت سے طلبہ ہیں جنھوں نے جوش و خروش میں MCSE میں داخلہ بھی لیا، امتحانات کے بعد اسناد بھی حاصل کرلیں لیکن کچھ عرصے بعد وہ اس میدان کو ہی چھوڑ گئے جس کی اصل وجہ کیریئر کے انتخاب میں معلومات کا فقدان ہے۔ MCSE کی تعلیم کے بعد صرف ایک پرچہ کامیاب کرتے ہوئے مائیکروسافٹ سرٹیفائیڈ بنایا جاسکتا ہے جس کے فوراً بعد CCNA کی تعلیم اور اس کا امتحان پاس کرنا کافی سودمند ہوگا۔

MCSE میں بھی خیال رہے کہ اختیاری مضمون کے انتخاب کے وقت مارکیٹ مطالعہ ضروری ہے۔ جیسے فی الحال اختیاری مضمون میں Exchange اور ISA سرور کی مانگ ساری دنیا میں ہے۔ اسی طرح بدلتے وقت کے ساتھ کئی مضامین کی مانگ بڑھتی اور گھٹتی ہے اس لیے بہتر ہے کہ امتیازی مضامین کے انتخاب میں احتیاط سے کام لیا جائے۔ کورس کی تکمیل کے بعد کیریئر کے آغاز کی باری آتی ہے اور یہاں بھی احتیاط ضروری ہے۔ کیریئر کے آغاز کے وقت طلبہ کے سامنے دو راستے ہوتے ہیں۔ پہلا وہ راستہ جس پر ہر نوجوان چلنا چاہتا ہے یعنی ڈریم جاب لیکن یہ اتنا آسان نہیں۔ نیز ڈریم جاب کے چکر میں طلبہ اکثر اوقات اچھے بھلے آفر کو ٹھکرا دیتے ہیں۔ یاد رہے کہ ''ڈریم جاب'' سے کہیں اہم ''بریک'' ہوتا ہے کیونکہ مارکیٹ میں ایک مرتبہ آپ کو ''بریک'' مل جائے تو لوگ آپ کو پہچاننا شروع کریں گے اور صلاحیتوں کو دکھانے کا آپ کو موقع ملے گا، جس کے بعد اچھے آفر آنا خود بخود شروع ہوں گے۔ بہتر ہے کہ ڈریم جاب کے چکر میں وقت برباد کیے بغیر ''آفر'' کو قبول کریں۔ اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ ''ڈریم جاب'' کا خواب ذہن سے نکال دیں بلکہ آفر کو ''ڈریم جاب'' کے لیے پہلی سیڑھی بنائیں۔ کمپیوٹر نیٹ ورکنگ شعبے میں کیریئر بنانے کے لیے پہلی سیڑھی ٹیکنیکل سپورٹ ایگزیکیٹو کی ملازمت ہے اور ان ملازمتوں کی مارکیٹ میں کمی نہیں۔ اس پہلی سیڑھی پر ایک سال کا عرصہ گزارنا بھی کافی ہوتا ہے کیونکہ اس میدان کے فریشرس کا ایڈمنسٹریٹر (Administrator) کی جگہوں پر تقرر نہیں ہوتا کیونکہ Adminitstrator جاب کے لیے 3-0یا5-3 سالہ تجربہ بنیادی شرائط میں داخل ہے لیکن مارکیٹ اسے شواہد پیش کرتی ہے کہ قابل طلبہ نے ٹیکنیکل سپورٹ ایگزیکیٹو کی پوسٹ پر ایک سال خدمات انجام دینے کے بعد حیدرآباد، بنگلور، دہلی اور چینئی جیسے شہروں میں ''ایڈمنسٹریٹر'' پوسٹ کے لیے درخواست داخل کی اور انھیں کامیابی بھی حاصل ہوئی۔

● مضمون کے متعلق اپنے سوالات کے اطمینان بخش جوابات کے لیے مضمون نگار سے Ehtesham245@gmail.com پر رابطہ قائم کیا جاسکتا ہے۔ میل کرتے وقت اپنے شہر اور ملک کا نام ضرور تحریر کریں۔

□□□

پتہ:
H.No. 1-19-125/3, Masjid Rasoolpura Police line,
Secundrabad, A.P. 500003

کنھیا لال نندن/مترجم: علی جاوید

عصمت چغتائی سے بات چیت

"میرا نام عصمت خانم چغتائی تو برتھ سرٹیفکیٹ کے رجسٹر کا ہے، گھر میں تو سبھی "چنی" کہتے تھے۔ چنی لکھتی دکھتی بھی ہے، کسی کو کیا معلوم ہوتا تھا۔ رجسٹر کا نام گھر میں کسی کو یاد نہیں آتا تھا۔ دس بھائی بہن تھے ہم... چار بہنیں، چھ بھائی۔ عظیم بیگ میرے بڑے بھائی تھے۔ انھیں نہیں معلوم تھا کہ چنی کا صحیح نام کیا ہے۔ گھر میں جو نام تھے، وہی اہمیت رکھتے تھے، رجسٹر کے نام رجسٹر تک محدود ہوا کرتے تھے۔" عصمت خانم بولتی جارہی تھیں اور باقاعدہ چٹخارے لے لے کر بول رہی تھیں: "دس اولادیں پالتے پالتے عاجز آگئی تھیں اماں۔ کہاں تک پالیں۔ جب کبھی ہم ان کے پاس جاتے تو کہتیں، "چل ہٹ، غارت ہو۔ تو یہاں کہاں سے گھس آئی۔" تو غارت ہونا پڑتا تھا لیکن گھر میں رشتوں میں اٹھنے والے سوال تھے وہ کہاں غارت ہوتے۔ وہ دل میں اٹھ کر رہ جاتے۔ جواب نہیں ملتا تھا۔ اصل میں ہم نے اپنے بچوں کے سوالوں کا جواب دینا بند کر دیا، اصول سمجھاتے رہے کہ یہ کرو، یہ نہ کرو، اس لیے وہ جواب مانگنے کے سلسلے میں دائروں سے باہر چلے گئے۔ ان بچاروں کا کیا قصور۔ میں ہمیشہ اپنی نئی نسل سے متاثر رہی۔ مجھ سے جتنا بنتا ہے، ان کے سوالوں کا جواب دیتی ہوں۔ مجھے ان سے کوئی شکایت نہیں ہے۔

عصمت آپا سے اگر آپ واقف ہیں تو آپ کو بھی ان کی شرارت بھری مسکان کے ساتھ سوالیہ نگاہوں کا سامنا کرنا پڑا ہوگا۔ تخلیق کی طرف مڑتے ہی سوال کرتی ہیں" آج تخلیق میں نقاد ہی نقاد چھائے ہیں۔ انھوں نے چھوٹے بچوں کو بھی ادھر ہی ہانکا ہے۔ تخلیق کہاں ہو رہی ہے؟ بتائیے کہاں ہو رہی ہے؟ اس کے پہلے کہ میں اس کا کچھ جواب دوں، انھوں نے ہی جواب دینا شروع کر دیا: "اردو پڑھنے والے اب رہے کہاں جارہے ہیں۔ سب تو موے انگریزی کی گود میں جا بیٹھے۔ میری بیٹیوں نے اردو نہیں پڑھی، بیدی (راجندر سنگھ بیدی) کے بچوں نے نہیں پڑھی۔ سردار جعفری کے بچوں نے، کرشن چندر کے بچوں نے... کسی نے تو نہیں پڑھی۔

- تب پھر آپ جو لکھتی ہیں، اسے کون پڑھتا ہے؟

مجھے پڑھنے والا غریب مسلمان ہے۔ وہ مجھے پڑھتا ہے۔ آج کا الیٹ (elite) مسلمان کا بچہ اب مجھے نہیں پڑھتا۔ وہ اردو ہی نہیں جانتا، پڑھے گا کیا؟ میرا باورچی اپنی بچی کو کانونٹ میں پڑھا رہا ہے، میں نے فیس بھری ہے اس کی۔

- جب اردو کے بارے میں آپ اتنی ناامید ہیں تو اردو کے موجودہ جھگڑے کے بارے میں، ہندی سے اس کے تعلقات کے بارے میں آپ سے کیا پوچھوں؟

پوچھنے کو آپ پوچھیے، لیکن میں آپ سے پوچھوں کہ ہندی میں نے پڑھی ہے لیکن میرے کس کام آتی ہے؟ اردو کو تو چھوڑیے، اردو کو تو پاکستان میں بھی مقام نہیں ملا۔

- اب ایک اور سازش ہو رہی ہے کہ اردو کو مذہب سے جوڑ کر اسلام سے نتھی کیا جارہا ہے...

بکواس ہے۔ اس ملک میں تو مذہب تباہ ہے۔ مذہب کیا چیز ہے، یہی نا کہ کسی کو مارو نہیں، قتل مت کرو، امن سے رہو؟ لیکن ہم نے مذہب کو بڑھاتے بڑھاتے دھندا بنا دیا... مٹھائی چڑھائیے، پیسے چڑھائیے۔ اس لیے مذہب کی شکل بگڑ گئی۔ اس سے زبان کو جوڑ دوگے تو زبان بھی تباہ ہو جائے گی۔ یونہی تباہ ہے بیچاری۔

- آپ کسی مذہب میں عقیدہ بھی رکھتی ہیں؟

میں سبھی دھرموں پر وشواس کرتی ہوں اور کسی دھرم کو نہیں مانتی۔ دھرم میرے لیے ہے۔ میں دھرم کے لیے نہیں ہوں۔ دھرم نے کہیں پر بھی کسی کا فائدہ نہیں کیا۔ بیوقوف لوگوں کو ڈرا کر مس یوز (Misuse) تو کیا ہے، فائدہ نہیں کیا۔

- تب پھر خدا کے بارے میں آپ کے خیالات دلچسپ ہونے چاہئیں۔ اسے آپ کیا مانتی ہیں؟

- خدا ایک طاقت ہے، ایسا مانتی ہوں۔ انرجی ہے، اٹامک انرجی بھی۔ یہ اپنے اپنے وشواس کی بات ہے۔ یوں ہر پوجا میں شریک ہو جاتی ہوں۔ مجھے کسی مندر میں، مسلمان ہوتے ہوئے پوجا کرنے جانے میں کوئی دقت نہیں ہوئی... اور وشواس کیسے جڑ پکڑتا ہے، اس کا ایک واقعہ بھی سن لو۔ جموں میں مندر میں گئی تو وہاں کے بندر بڑے بدمعاش، ہر کسی کا

پرساد گرا کر کھا جائیں، ڈرا کے۔ سب کا گرا دیا، میرا نہیں گرایا۔ میں نے بندر سے باتیں کرنا شروع کر دیا کہ لینا ہے تو لے جاؤ۔ میرا نہیں ہے، یہ تو ایشور کا ہے۔ میں نہیں ڈری، وہی ڈر گیا۔ پرساد بچ گیا۔

- اس سے وشواس نہیں اندھ وشواس جڑ پکڑتا ہے آپا۔ اگر دھرم میں نہیں تو آپ مارکس میں وشواس کرتی ہوں گی۔
- ہاں، مارکس میں وشواس کرتی ہوں۔ اس لیے کہ ہمارے یہاں کا پرانا فلسفہ مارکس سے تعلق رکھتا ہے۔ ہمارے رشیوں، عالموں کا یہی اصول تھا کہ پیسے کے پیچھے مت بھاگو، سب کی ضرورتوں کا خیال رکھو۔ میں اس نظریے کا سب کچھ تو مارکس میں نہیں لا سکتی، لیکن مارکس نے میری سوچ کو زمین دی ہے... لیکن میں نے یہ تو نہیں کہا کہ دھرم میں وشواس ہی نہیں کرتی۔ کرتی بھی ہوں۔ نہیں بھی۔
- تب پھر آپ کو ایشور کا کوئی نہ کوئی روپ بھی پسند ہوگا؟
- پسند ہے، کنھیا۔ وہ میرا فیورٹ گاڈ ہے جس نے گوپیوں سے کہا کہ کیا اپنے بدن سے شرم کرتی ہو۔ شرم کو چھوڑو، زندگی کو جیو۔ کرشن میری نگاہ میں ایک انقلابی دیوتا تھا۔ زندگی سے لبریز۔ ویسے میرے یہاں لکشمی، سرسوتی اور چنڈی بھی ہیں۔
- آپ نے اپنی تخلیق میں عورت کا کون سا روپ ابھارنا زیادہ پسند کیا؟
- میں نے تو صرف حقیقت بیان کرنا پسند کیا ہے۔ آج بھی صبح اٹھ کر اخبار پڑھتی ہوں۔ دیکھتی ہوں اتنا ہنگامہ روز ہو رہا ہے۔ میری تخلیق بھی اخبار کے جیسے حادثات سے تعلق رکھتی ہے۔ میں تو اپنے آس پاس میں رہنے والوں کے بارے میں لکھتی ہوں۔ ان میں عورت بھی ہوتی ہے، مرد بھی ہوتا ہے۔
- دونوں میں، آج کے سماج میں آپ کو زیادہ پستا ہوا کون معلوم ہوتا ہے؟

غریب طبقے میں دونوں پس رہے ہیں۔ امیر گھر کے مرد اور عورت دونوں مزے کر رہے ہیں۔ کچھ طبقے ہیں جہاں دونوں ایک دوسرے کی شکایت کرتے ملتے ہیں۔ پھر بھی یہ محسوس کرتی ہوں کہ سماج میں مرد کو زیادہ دبایا گیا ہے۔ پہلے ماں، پھر بیٹی۔ بہن اور پھر بیوی دباتی ہے۔ پہلے اسے سمجھایا جاتا ہے کہ ماں کے پیر کے نیچے جنت ہے، پھر کہا جاتا ہے کہ بہن کا بوجھ تیرے سر پر ہے، پھر اسے سمجھایا جاتا ہے کہ بیٹی تو تیری عزت ہے... اس سب میں مرد پستا رہتا ہے۔

- لیکن جب مرد ایک عورت کی مٹی پلید کر کے دوسری عورت کے ہاتھوں اسے ذلیل کرتا ہے، تب بھی آپ کو عورت کی حالت ٹینشن نہیں کرتی؟
- ٹینشن ہونا نہ ہونا ایک بات ہے، لیکن حقیقت اپنی جگہ ہے۔ آپ کو پتہ نہیں ہے کہ عورت کی تکڑم بازیاں کیسی کیسی ہیں؟ یہ نہ بھولیں کہ عورت کی وجہ سے ہی دوسری عورت کی مٹی پلید ہوتی ہے۔ عورت کو ذلیل کرانے کے لیے دوسری عورت ہی ہے جو آگے آتی ہے۔ پہلے اسے اپنے جال میں پھنساتی ہے، پھر دوسری عورت کو بے دخل کرتی ہے۔ اس میں مرد کو گنہگار کیوں مانوں؟ میں تو چاہتی ہوں کہ عورتیں، مرد کا ٹیٹوا پکڑنا چھوڑ دیں لیکن میں یہ بات شاید لوگوں کو سمجھا نہیں پائی اور مجھے الٹا عورتوں کی آزادی کا حامی اور انکا نمائندہ مان لیا گیا۔
- آپ کی یہ بات مان بھی لوں تو مرد کا اتنا گناہ تو آپ بھی مانیے گا کہ وہ دوسری عورت کی طرف مڑا، اس پر فدا ہوا۔

اگر مرد کسی عورت پر فدا ہوتا ہے تو اس میں گناہ کیا ہے؟ اب تو الٹے لڑکیوں کو یہ شکایت ہے کہ کمبخت لڑکے ان کا نوٹس نہیں لیتے۔ سچ کہوں مرد تو یار پھسپھسے ہوتے ہیں۔ کالج میں اگر کسی نے مجھ پر کبھی کوئی دلکش پھبتی کسی اور میں نے پلٹ کر اتنا ہی پوچھ لیا کہ ''جی آپ نے کچھ کہا'' تو بچارے کی گھگھی بندھ جاتی تھی۔

- ایسے حالات میں آپ نے کبھی شرمانے کی اہمیت کو آنکا ہے؟

کیوں شرمائیں۔ شرم کی بات کریں تو شرمائیں۔ ہم تو عاشق کی ''لیگ پلنگ'' کرتے تھے۔ کس کے کھنچائی کرنے میں یقین رکھتے تھے۔ میں نے تو لڑکوں سے ہمیشہ ''کمپیٹ'' (مقابلہ) کرنے کی کوشش کی۔ بھائیوں کے ساتھ رہ کر گھوڑے کی سواری وغیرہ سب کرتی تھی۔ ارے میاں؛ تمھیں پتہ نہیں ہے، عورتیں بڑی گندی گندی باتیں کرتی ہیں۔ میری دوستی مردوں سے زیادہ رہی۔ میں نے اپنی باتیں کھلے طور پر ان سے کہہ بھی دیں اور لکھ بھی دیں۔ شرمانے کی اس میں کیا بات ہے۔

- شاید اسی لیے آپ کے ساتھ ''بولڈ'' تخلیق کا سرٹیفکیٹ جڑ گیا؟
- میں نے اپنے کو حقیقت بیان کرنے والا مانا۔ ''بولڈ'' ہوں یہ تو لوگوں نے کہا اور اسی ڈنڈے کو لوگوں نے تھام لیا۔ میرا اس میں کوئی نقصان بھی نہیں ہوا۔ کوئی شکایت بھی نہیں۔ بلکہ الٹے فائدہ ہی ہوا۔ جو سچ لکھے وہی میرے لیے ''بولڈ'' ہے۔ اس زمانے میں عورتیں میرے جیسا نہیں لکھتی تھیں، اس لیے شاید میرے لیے یہ فقرہ چل پڑا۔
- ''بولڈ'' تخلیق تھوڑا بنیادی معنوں میں جنسی بیان سے جڑ گئی۔ اس بارے میں آپ کیا سوچتی ہیں؟
- سوچتی یہ ہوں کہ سیکس کو ہمیشہ گندا ہی کیوں مانا جائے۔ سیکس مقدس بھی تو مانا جا سکتا ہے۔ یہ تو ماننے ماننے کا فرق ہے۔ سیکس گندا کہاں ہوتا ہے جہاں وہ بیچا اور خریدا جاتا ہے۔

- عورت مرد کے ہر ممکن تعلق کو بنیاد بنا کر آپ نے کہانیاں لکھیں اور منٹو نے بھی۔ آپ دونوں ہم عصر اور دوست افسانہ نگار رہے ہیں۔ منٹو کی تخلیق نگاری کی حمایت آپ نے عدالت تک میں کی۔ پھر کیا وجہ رہی کہ منٹو نے تو سماجی برائیوں پر لگاتار چوٹ کی اور آپ نے دلچسپ راز کی باتوں پر سے پردہ اٹھا کر ہی چھوڑ دیا۔ ایسا کیوں؟
- یہ راز کی دلچسپ باتوں پر سے پردہ اٹھانا میری نظر میں زیادہ اہم تھے۔ میں تو جو دیکھتی تھی، وہی لکھتی تھی کہ ایسا سماج میں ہو رہا ہے، ہو سکے تو روکو۔ منٹو کی کہانیوں میں اور مجھ میں یہ فرق ہے کہ ہم دونوں مسائل اور ان کے حل کے نظریے میں غیر متفق نہیں رہے لیکن منٹو کے یہاں سیاست بھی آ گئی، میں سیاست سے بچتی رہی۔ میں تو یہ دیکھنا چاہتی تھی کہ مرد کی چھینا جھپٹی میں عورت کیسے سستی ہو گئی اور مرد کو جھپٹنے کے چکر میں عورت کیسی کیسی حرکتیں کرتی ہے۔
- آپ اس چھینا جھپٹی کو جسم کی ضرورت کا حصہ مانتی ہیں یا روحانی یا کچھ اور؟
- میں اس میں زیادہ تر معاشی پہلو کو ذمے دار مانتی ہوں۔ یہ پیسہ کمبخت بڑی خراب چیز ہے، یہ عورت مرد کے تعلقات ہی نہیں، ترقی پسند تحریک تک میں گھس کر اسے چوپٹ کر گیا۔
- لکھنؤ کے ترقی پسند ادیبوں کی کانفرنس میں جو زبان کے مسئلے پر پینترے بازی ہوئی تھی، اس کی طرف تو آپ کا اشارہ نہیں ہے؟
- میں ان دنوں یہاں تھی ہی نہیں، اس لیے نہیں کہہ سکتی کہ لکھنؤ میں کیا ہوا۔ لکھنؤ میں تو پتے بازیاں ہیں۔ جب انھوں نے دیکھا کہ انقلابی بن کر پیسہ ملتا ہے تو یہ انقلابی بن گئے۔
- کون؟
- نام میں کسی کا نہیں لوں گی۔ لیکن ترقی پسندی سے آمدنی کا جڑ جانا اس کو چاٹتا چلا گیا۔
- کیا وجہ ہے کہ ترقی پسندی کی لہر کے ساتھ شروع سے ہی جڑ جانے کے باوجود اردو ادب خاص کر افسانہ اپنے لیے وہ جگہ نہیں بنا سکا جو ہندی یا دوسری ہندوستانی زبانوں کی کہانی نے بنالی ہے؟
- یہ میں کیسے مانوں۔ پاکستان میں خوب لکھا جا رہا ہے۔ یہ فتوے دینے والے کمبخت ''کریٹک'' ہیں، آلوچک جنھیں کہا کرتے ہیں آپ لوگ، وہ نوجوانوں کی قلم پر ایسے ہی اعتراض کرتے اور فتوے دیتے رہتے ہیں جیسے بڑھیوں کی جوانی چلی جانے پر وہ نوجوانوں پر اعتراض کرتی رہتی ہیں۔ میں نے اردو کے ان گھٹنوں کو کبھی گھاس نہیں ڈالی۔
- آپ گھاس نہ ڈالیں تب بھی وہ گھاس لے لیتے ہیں۔ مگر اب تو لوگ بھی ہیں کہ کرشن چندر جیسے مصنف کو بھولنے لگے ہیں۔ بیدی کا بھلے پھر سے تجزیہ شروع ہو گیا ہے۔ آپ کو ایسا نہیں لگتا؟
- اس میں افسوس کس بات کا؟ ہم نہیں بھول گئے تھے اپنے زمانے میں بڑے بڑے ادیبوں کو؟ اسی طرح آج کے بچے بھی بھول جائیں گے۔ مجھے اس بھولنے۔ بھولنے سے کوئی شکایت نہیں ہے۔ رہی کرشن چندر کی بات، تو کرشن کے بہت زیادہ پھیلے ہونے سے اردو والے بھٹکتے رہتے ہیں۔ کرشن لکھتے اتنا زیادہ تھے کہ اس میں کچھ واہیات بھی لکھا ہوگا۔ بیدی چھن چھن کر لکھتے تھے۔ اصل میں ان لوگوں کو لڑکیوں نے تباہ کر دیا۔ کرشن تو شروع سے ہی کھلنڈرے تھے، سو لوگ انھیں معاف کرتے رہے لیکن بعد میں بیدی کو بھی ایک لڑکی ہی لے ڈوبی۔ میں نے ان کے بجائے ان کی بیویوں سے ہی زیادہ تعلقات بنائے۔
- آپ کی پسند کی عورتیں کون سی رہیں؟
- جاہل عورتوں سے میری دوستیاں بیحد گھنی رہی ہیں۔ جاہل عورتیں میں نے چالاک بھی بہت دیکھی ہیں۔ انھیں شاید اس کی ضرورت بھی ہوتی ہے۔ منٹو کو کوئی لڑکی نہیں پھانس سکی تھی۔ اسے اپنی بیوی بہت پسند تھی۔
- آپ گھوم پھر کر پھر اسی عورت پر آ گئیں۔ آپ کی کہانیوں میں جو عورتیں ہیں...
- آپ اپنا جملہ پورا کریں، اس کے پہلے ہی کہہ دوں کہ میری کہانیوں میں یہ کھاتی عورتیں زیادہ ہیں۔ ''چارپائی'' کہانی میں میں نے اس کا خوب پردہ فاش کیا ہے۔
- عورت کی دنیا کو اتنی ہوشیاری اور خوبی کے ساتھ دیکھنے والی آپ جیسی مصنفہ شاہ بانو والے مسئلے پر خاموش کیوں رہی تھیں؟
- اسے میں شاہ بانو کی بیوقوفی مانتی تھی۔ اس نے اپنے بڑھاپے کے لیے بچا کر کیوں نہیں رکھا کہ اس کے بچے اس دولت کے لالچ میں اس کی حفاظت کرتے۔ مرنے کے وقت وہ جس کو چاہتی جو کچھ بانٹ دیتی۔ شاہ بانو نے اپنا سب اپنی اولادوں کو دے دیا۔ میری ماں نے بھی یہی کیا تھا۔ تب کی عورتیں کرتی ہی یہی تھیں۔ اولادیں بھی ان کا خیال رکھتی تھیں۔ اب اصول بدل گئے ہیں۔ اس کا خیال شاہ بانو کو کرنا چاہیے تھا۔ میں نے اپنا پورا پیسہ اپنے بچوں کو ابھی تک نہیں دیا۔ میں ان کے لیے مرتے وقت تک بیش قیمت رہوں گی۔ میں تو اس سارے مسئلے کو معاشی پہلو سے جوڑ کر دیکھتی ہوں۔
- یعنی رشتے ناتے سب دولت پر مبنی ہوتے ہیں؟
- ہوتے ہی ہیں۔ اخلاقی اصول کہاں ہیں؟ ہر ایک تو چوری کر رہا ہے، بے

ایمانی کر رہا ہے۔ اخلاقی اصول پھر ان رشتوں میں آئیں گے کہاں سے؟

- اس کا مطلب ہے آپ کی نظر میں شادی ایک بے معنی یا مطلب پسند سہولت ہوکر رہ گئی؟ تو کیا ضروری ہے شادی کرنا؟

- قطعی ضروری نہیں ہے۔ اپنی مرضی کا مسئلہ ہے، کرو یا نہ کرو۔ پبلک کو اس میں بیچ میں آنے کی کیا ضرورت ہے۔ میری بیٹی نے اپنی ساس کے پاس جب خوب سارا زیور دیکھا تو بولی ''اگر میں آریہ ساجی ہو جاؤں تو میری ساس بڑا سارا دھن دے دے گی۔'' میں نے کہا تم اگر اس تبدیلی پر یقین کرتی ہو تو ہو جاؤ۔ میری نگاہ میں سارا مسئلہ معاشی ہے۔ جس کے لیے ایک عورت مذہب تبدیل کرنے تک کو تیار ہے۔

- عورت مرد کے رشتوں کو آپ صرف معاشی چشمے سے دیکھیں گی تو اس رشتے کے اور بہت سارے پہلو ان دیکھے رہ جائیں گے۔ اپنے دیش میں شادیاں ٹوٹنے کا جو سلسلہ بڑھا ہے اس کی بنیاد صرف معاشی نہیں ہے۔

- میں ان پہلوؤں کو ان دیکھا نہیں کرتی بلکہ ان پہلوؤں کو سارے دنیا کے آئینے میں دیکھتی ہوں۔ اتنی ساری لڑائیاں لڑتے لڑتے مرد کم پڑ گیا۔ عورتیں زیادہ ہیں۔ پوری دنیا میں دیکھ لیجیے۔ شادی تو پوری دنیا میں ٹوٹ رہی ہے۔ اپنے یہاں ایک شادی کا قانون ہے۔ اس لیے شادی اندر اندر ٹوٹ رہی ہے۔ یورپ میں قانوناً ٹوٹ رہی ہے۔ اپنے یہاں غیر قانونی طریقے سے ٹوٹ رہی ہے۔

- عورتوں کی تعداد زیادہ ہونے پر بھی اردو میں خواتین افسانہ نگاروں کی کم تعداد آپ کو کھلتی نہیں؟

- میں یہ مانتی ہی نہیں کہ اردو میں خواتین افسانہ نگار کم ہیں۔ بہت ہیں۔ پاکستان میں تو بے حد ہیں۔ ہمارے یہاں اردو پڑھنا چھوٹ گیا ہے۔ اس لیے لکھنے والی بھی کم نظر آنے لگیں۔ میری یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ آپ لوگ ہندی والے اردو میں چھپ کر اس غریب مسلمان تک کیوں نہیں پہنچانا چاہتے جو بے چارہ چاؤ سے پڑھتا ہے اور وہ طبقہ یہاں کم نہیں ہے۔

- ایک طرف آپ اردو زبان کے موجودہ حالات سے پریشان نظر آتی ہیں۔ دوسری طرف اس سے بڑی پُر امید لگتی ہیں۔ آپ کہنا کیا چاہتی ہیں؟

کہنا یہ چاہتی ہوں کہ اردو کو دبا نہیں سکتے۔ کچھ بھی کریں اسے یہی غریب مسلمان زندہ رکھے گا جس کا زبان کی سیاست سے کوئی لینا دینا نہیں ہے۔ میں اس کی طرف تمھارا دھیان کھینچنا چاہتی ہوں۔ اس کی سوچو۔ کتنا بڑا طبقہ ہے وہ۔

- اردو کے مسئلے میں آپ پاکستان کے مصنف کی تو بات کرتی ہیں لیکن وہاں کے اردو پڑھنے والوں کی بات دوسرے انداز میں کرتی ہیں۔ ایسا کیوں؟

- پاکستان میں اردو مصنف ہیں، پڑھنے والے بھی ہیں ہی لیکن اردو کو اہمیت دینے والے نہیں ہیں۔ انھوں نے تو یہاں سے گئے مسلمان تک کو مان کر نہیں دیا۔ ان کی زبان کی بات تو دیگر ہے۔ وہاں کے سندھی، بلوچی، پنجابی اور پیشاوری نے یہاں سے گئے مسلمان کو مان کے نہ دیا آجکل تو وہاں فرقہ وارانہ فساد بھی شروع ہو گئے ہیں۔

- آپ نے اتنی ساری کہانیاں لکھیں۔ چلتے چلتے یہ بھی جاننا چاہتا ہوں کہ کسی ایسی کہانی کو یاد کیجیے جس نے آپ کے سارے کٹرپن کے باوجود سب سے زیادہ پریشان کیا ہو۔

- بڑی تکلیف وہ بات چھیڑ دی تم نے۔ میں نے ایک کہانی لکھی تھی، ''زہر کا پیالہ''۔ اس نے مجھے زندگی میں سب سے زیادہ تکلیف پہنچائی۔ خوب کس کے ''ٹارچر'' کیا۔ وہ کہانی میں نے ایک ایسی عورت پر لکھی تھی جو مجھے دودھ پلانے کے لیے کرائے پر رکھی گئی تھی۔

- یعنی آپ نے اپنی ماں کا دودھ نہیں پیا۔ ہمارے راشٹر پتی جی نے ان ماؤں کو اچھا نہیں مانا جو اپنے بچوں کو اپنا دودھ نہیں پلاتیں۔ آپ نے حال میں اخباروں میں اس کا ذکر پڑھا ہوگا۔

- راشٹر پتی جی کیا مانتے ہیں یہ یہاں سوال نہیں ہے۔ یہ ہے کہ مجھے اپنا دودھ پلانے کے لیے جس چمارن کو رکھا گیا تھا اس کا دودھ پی کر میں بڑھی۔ میرے بچپن میں دودھ پلانے والیاں کرائے پر ملتی تھیں۔ اس عورت کے لیے میرے دل میں کتنی عزت تھی اس کا میں بیان نہیں کر سکتی۔ جب کافی بڑی ہوگئی تو وہ ایک دن آئی۔ ایک پیالہ لیے ہوئے مجھ سے اکیلے میں پوچھنے لگی کہ ''بیٹی میرا دودھ پیے گی۔'' میں بڑی ہوگئی تھی شرما گئی شاید۔ بعد میں وہ پاگل ہوگئی۔ اس پر میں نے کہانی لکھی۔ اف! آج بھی دہل جاتی ہوں اس عورت کے بارے میں سوچ کر، کن حالات میں اس کی موت ہوئی بیان نہیں کر سکتی۔ اس کہانی نے مجھے ہمیشہ ستایا۔ جب جب اس پر سوچا تب تب ستایا۔ اب اس پر زیادہ نہ چھیڑو۔

- معافی چاہتا ہوں۔

(ہندی سے)

□□□

محمد حبیب/خلیق احمد نظامی (ہماری مطبوعات سے)

ترکی حملوں کے وقت ہندوستان کی حالت

ذات کا نظام: ہندوستان میں سلطان محمود کی کارگزاریوں (999-1031) کے بعد کے ڈیڑھ سو سالوں کے عرصے میں راجپوت سلطنتوں کی ابتدا ہوئی۔ ذات کے نظام میں اور شدت پیدا ہوئی اور گنگا کے میدانی علاقے میں ترکوں کا دباؤ بڑھا۔ ان محرکات کی وجہ سے ملک کی سیاسی اور سماجی زندگی میں جو صورت حال پیدا ہوئی اس نے ہندوستان میں غوریوں کی فتح کی راہ ہموار کردی۔ راجپوتی نظامِ سیاست (Polity) جاگیردارانہ اداروں کو وجود میں لائی۔ ذات کے نظام نے سماج کو الگ الگ ٹکڑوں میں تقسیم کردیا اور ایک مشترکہ شہریت کے احساس کو مٹا دیا اور ترکوں کی آزمائشی (reconnoitering) کارروائیوں نے ہندوستان کی بنیادی (فوجی) کمزوری کو ظاہر کرکے بڑے پیمانے پر فوجی اقدامات کی حوصلہ افزائی کی۔

راجپوتوں کی ابتدا کے متعلق مختلف نظریات سے بحث اس موقع پر غیر ضروری ہے۔ البیرونی کی کتاب الہند میں راجپوتوں کا ذکر نہیں ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ البیرونی نے جس طبقے کو چھتری کا نام دیا ہے وہ رفتہ رفتہ جنگجو قبیلے کی حیثیت سے برسر اقتدار آگیا تھا۔ یہ لوگ شجاعت اور اولوالعزمی کی رومانی روایت میں رنگے ہوئے تھے اور ان کو راجپوت یا راج پتر... یعنی شاہی نسل کے اخلاف کہا جانے لگا۔ انھوں نے دریائے ستلج سے سون تک کے علاقے پر اپنا قبضہ جمالیا تھا۔ غوریوں کو اس نئے ذی اقتدار طبقے سے نپٹنا پڑا۔ چونکہ بارھویں صدی کے سپاہی میدان میں سمبھر اور اجمیر کے چوہانوں، مالوہ کے پرمپرا اور وچیدی کے کلاچوریوں، بندیل کھنڈ کے چنڈیلوں، گجرات کے چالوکیوں، قنوج کے گڑھوال، مگدھ کے پالوں اور مغربی بنگال کے سوروں اور پھر بعد میں سیناؤں کا دور تھا۔ متعدد خود مختار ریاستوں پر مبنی یہ سیاسی نظام بارھویں صدی کے آخری ربع کے ہندوستان کی ایک اہم خصوصیت تھی۔ ہندوستان متعدد ریاستوں کا ایک مجموعہ تھا جس کی ہر ریاست خود مختار تھی۔ آپس کی حاسدانہ چشمکوں اور جارحانہ اقدامات کی وجہ سے ریاستوں کی سرحدیں بدلتی رہتی تھیں اور ناقابل اصلاح گہری دشمنی کے جذبات کو دائمی بنا دیا تھا۔

یہ راجپوت ریاستیں جاگیردارانہ نوعیت کی تھیں، ہر سلطنت شاہی خاندان (کول) کے افراد کو دی ہوئی جاگیروں پر مشتمل تھی۔ اگلے دور میں اس طرح کے جاگیری ماتحتوں (Vassals) کی ذمے داریوں کا ذکر کرتے ہوئے ڈاکٹر اے، ایس الٹیکر لکھتے ہیں کہ ان ماتحتوں کو سکہ جاری کرنے کا اختیار نہ تھا اور ان کو یہ کام انجام دینے پڑتے تھے۔ (الف) اپنے سربراہ کے نام کا (اپنے کتبوں) ذکر کرنا (ب) تقریب کے موقعوں پر دربار میں حاضر ہونا (ج) باقاعدگی سے خراج ادا کرنا (د) تقریب کے موقعوں پر اور لڑکیوں کی شادی کے موقعوں پر تحفے دینا (ہ) مقررہ تعداد میں افوجی دستہ فراہم کرنا لیکن زیر مطالعہ دور میں ان ذمے داریوں سے تغافل برتا جانے لگا تھا اور اس کے برعکس جاگیرداروں کی طاقت بڑھ جانے اور اپنی فوج کو اکٹھا کرنے اور ٹیکس عائد کرنے کی وجہ سے سیاسی اقتدار منتشر ہوگیا تھا اور مرکز گریز (Centrifugal) رجحانات مخصوص ہوگئے تھے اور اس کی وجہ سے بادشاہ کا اقتدار کمزور ہوگیا تھا۔ ذاتی فوجیں رکھنے کی وجہ سے جاگیرداروں میں بڑے پیمانے پر جنگیں ہوتی رہتی تھیں اور اس کی وجہ سے مزید انتشار پیدا ہوتا تھا۔

جب ترک ہندوستان میں داخل ہوئے اس وقت جاگیردارانہ نظام اپنی تاریخ کے آخری اور سب سے شورش انگیز دور میں داخل ہو چکا تھا اور جاگیروں کی تقسیم در تقسیم (Sub-Infeudation) کا طریقہ زیادہ مروّج ہوگیا تھا اور اکثر بڑے جاگیرداروں کے تحت ان کے چھوٹے جاگیردار تھے۔ مثلاً سامنت، ٹھاکر، راوت وغیرہ ہوتے تھے۔ مثلاً راشٹر کوٹوں کے ماتحت گجرات کے راشٹر کوٹ اور سلاہار تھے اور پھر ان ماتحتوں کے اپنے ماتحت تھے۔[1] کشمیر کے سیاسی میدان میں ڈمرا (جاگیردار، سردار) سب سے زیادہ پریشان کن عنصر تھے۔[2] وہ اپنے چھوٹے محلوں میں رہتے تھے۔ ان کی ذاتی فوج تھی اور اپنے مفاد کے مطابق جب چاہتے مرکزی حکومت کی خلاف ورزی کرتے۔ درحقیقت ملک کی انتظامیہ خاص کر اندرونی علاقوں میں ان کے ہاتھوں میں تھی۔

یہ نظامِ سیاست ملک کے سماجی نظام کی بنیادی کمزوری کی عکاسی کرتا تھا۔ ذات کی نظام نے جس پر گیارھویں اور بارھویں صدی کا ہندوستان سماجی نظام مبنی تھا، مشترکہ شہریت اور حب الوطنی کے تمام جذبات کو ختم کردیا تھا۔ اس نظام

"جامع تاریخ ہند" سے ماخوذ، مصنف: **محمد حبیب/خلیق احمد نظامی** /صفحات 1000، قیمت: -/306

نوٹ: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی جانب سے طلبہ اور اساتذہ کے لیے بالترتیب 45% اور 40% کی خصوصی رعایت دی جاتی ہے۔ تاجران کتب کو قومی اردو کونسل کے ضوابط کے مطابق رعایت دستیاب ہے۔ ادارہ

کی ابتدا خواہ کسی بھی صورت حال میں ہوئی ہو اس کے نتیجے کے طور پر شہریت اور ملک سے وفاداری کے احساس کا مکمل فقدان تھا۔ اس کے زیر اثر حالات میں جو انفرادی اور اجتماعی ابتری پیدا ہوگئی تھی وہ اپنے نتائج کے لحاظ سے تباہ کن ثابت ہوئی۔ ڈاکٹر بنی پرشاد اس پر تبصرہ کرتے ہیں کہ یہ (ذات نظام) گروہ (جماعت) کو ترجیح دینے میں انفرادی اقدار کو قربان کردیتا ہے۔ یہ انفرادیت کی جڑوں پر ضرب لگاتا ہے اور یہ (انفرادی) شخصیت کے باوجود انکار کے مترادف ہے۔ عمومی (Universal) ہے اور نہ اس کو اپنی شخصیت کے اظہار کا اپنی خواہشات کو طے کرنے کا اور اپنے مفاد کو حاصل کرنے کا اختیار ہے۔ ذات کا اصول انسان کی من حیث الانسان عظمت کے منافی ہے۔[3]

ہندوستانی سماج کی چوٹی پر چار ورن یا ذاتیں تھیں۔ برہمن، چھتری، ویش اور شودر۔ گرچہ طبقے ایک دوسرے سے مختلف تھے، پھر بھی سب ایک ہی شہر اور گاؤں میں رہتے تھے۔

البیرونی لکھتا ہے کہ ''ہندو اپنی ذات کو ورن یعنی رنگ کا نام دیتے ہیں اور نسبی اعتبار سے ان کو جاتک (یعنی پیدائش) کہتے ہیں۔ شروع سے ہی یہ ذات صرف چار ہیں۔ برہمن، چھتری، ویش اور شودر۔[4]

سماجی نظام میں سب سے اونچا مقام برہمنوں کا ہے۔ وہ تمام مخلوقات میں سب سے اعلیٰ سمجھا جاتا تھا۔[5] اور مذہبی معاملات اس کی اجارہ داری میں تھے۔ البیرونی کے مطابق صرف برہمن اور چھتری وید کی تعلیم حاصل کرتے تھے۔ لہٰذا مکش یا نجات صرف انھی کو حاصل ہوسکتی تھی۔[6]

سماج کے درجاتی نظام (Social Hierarchy) میں دوسرا مقام چھتریوں کا تھا۔ ملک کا انتظام اور اس کی سرحدوں کی حفاظت کا کام ان کے ذمے تھا۔ بقیہ دو ذاتیں۔ ویش اور شودر کو سماج کے درجاتی نظام میں نیچا مقام دیا گیا تھا۔ ویش کا مخصوص کام یہ تھا کہ کھیتی کرے مویشی پالے یا اپنا ذاتی یا کسی برہمن کی طرف سے کاروبار کرے۔ شودر کی حیثیت بقول البیرونی برہمن کے نوکر جیسی تھی۔[7] ویش اور شودر کو مقدس (مذہبی) علوم سے محروم رکھا گیا تھا۔ البیرونی کے مطابق اگر یہ ثابت ہوجاتا کہ کسی ویش یا شودر نے وید پڑھا تو اس کی زبان کاٹ لی جاتی تھی۔[8] اس پر تبصرہ کرتے ہوئے پروفیسر حبیب لکھتے ہیں ''ایسی پالیسی رگ وید کے عہد میں ضروری رہی ہو یا نہیں لیکن گیارھویں صدی میں البیرونی، بوعلی سینا اور سلطان محمود کے دور میں یہ ایک حماقت اور پاگل پن تھا اور خودکشی کے مترادف اور خود برہمنوں کو، جو ایک منطقی اور بہت ہی روشن خیال طبقہ تھا، اس ناقابل معافی گناہ کی بہت بھیانک قیمت ادا کرنی پڑی۔[9]

ان چار ورنوں کے نیچے غیر اہم معمولی انسانوں کا جم غفیر تھا جن کو انتیاجہ کہا جاتا تھا۔ ان کا شمار کسی ذات میں نہ تھا بلکہ ان کا تعلق پیشہ یا حرفہ سے تھا۔ ان کے آٹھ پیشہ ورانہ گروہ تھے۔ (1) قصار (2) چمار (3) نٹ (Juggler) (4) ٹوکری اور ڈھال بنانے والے (5) ملاح (6) مچھلی فروش (7) جنگلی جانوروں اور طیور کے شکاری (8) جولاہے۔ یہ لوگ چار اعلیٰ ذاتوں کے بسنے والے شہروں کے نزدیک رہتے تھے لیکن ان کے باہر[10] البیرونی لکھتا ہے کہ اگر کوئی شخص اپنی ذات کے کام اور فرائض کو چھوڑ کر دوسری ذات کے کاموں اور فرائض کو اختیار کرنا چاہے تو اس کو گناہ سمجھا جاتا۔ خواہ اس سے اس ذات کی عزت افزائی ہی کیوں نہ ہو۔[11]

سب سے کم درجہ کے لوگ ہادی، ڈوم، چانڈال اور بدھاتو تھے۔ ان کے ذمے سب سے گندے اور ناپاک کام تھے۔ مثلاً گاؤں کی صفائی اور دیگر خدمات۔ البیرونی کے مطابق ان کو حرام زادوں (ناجائز بچوں) کی طرح سمجھا جاتا تھا اور ان کا شمار ذات کے باہر ہوتا تھا۔[12] وہ شہر کی چار دیواری کے اندر نہیں رہ سکتے تھے اور شہر کی صفائی وغیرہ کے لیے جس کے بغیر کسی قسم کی شہری زندگی شاید ناممکن تھی۔ شاید مقررہ اوقات پر اطلاع کے مطابق شہر کے اندر داخل ہوتے ہوں گے۔[13]

عہد وسطیٰ کے ہندوستان کے سماجی نظام پر سب سے مہلک اثر جسمانی ناپاکی (چھوت) کے اصول سے ہوا۔ البیرونی نے حیرت اور تنفر کے ساتھ لوگوں کی سماجی زندگی میں اس اصول کے اطلاق کا ذکر کیا ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ ہر شے جو نجاست میں ملوث ہوجاتی ہے وہ پھر سے کامیابی کے ساتھ کوشش کرتی ہے کہ اپنی اصل پاک حالت کو حاصل کرلے۔ سورج اور ہوا فضا کی صفائی کرتے ہیں اور سمندر کے اندر نمک گندگی کو پھیلنے سے روکتا ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتو اس کرۂ زمین پر زندگی ناممکن ہوجاتی۔ لیکن برہمنوں کا چھوت کا اصول فطرت کے اس مسلمہ اصول کے خلاف ہے۔ اگر کوئی ہندو سپاہی کسی مسلمان کا قیدی بن جاتا اور بعد میں رہا کردیا جاتا تو اس کی ذات والے یا اس کے ہم پیشہ اس کو اپنا ماننے سے انکار کردیتے۔ البیرونی لکھتا ہے کہ ''یہ بات مجھ سے کئی مرتبہ کی گئی کہ (مسلم ملکوں سے) جب ہندو غلام بھاگ کر اپنے ملک و مذہب کو واپس آتے ہیں تو مقامی ہندو یہ حکم دیتے ہیں کہ وہ لوگ کفارہ کے طور پر پرائشچت کریں۔ تب وہ ان کو گوبر اور گائے کے دودھ کے ڈھیر میں کئی دنوں تک دبائے رکھتے ہیں، یہاں تک کہ وہ گندگی سڑنے لگتی ہے پھر وہ ان کو اس گندگی سے باہر کھینچتے ہیں اور اس کو کسی طرح کی غلاظت کھانے کو دیتے ہیں۔ میں نے اکثر برہمنوں سے دریافت کیا کہ کیا یہ بات صحیح ہے مگر وہ اس سے انکار کرتے ہیں کہ ایسے شخص کی نجات ممکن ہی نہیں اور اس کو اس مقام تک پھر کبھی نہیں پہنچنے دیا جاتا جس پر وہ قید ہونے سے پہلے تھا اور یہ ممکن بھی کیسے تھا؟ اگر کوئی برہمن کسی شودر کے گھر میں چند دنوں تک کھالے تو وہ اپنی ذات سے خارج کردیا جاتا ہے اور

پھر اس میں داخل نہیں ہوسکتا۔[14] ایسے قیدی جن کو خود ان کے فرقہ والے خارج کردیتے ہیں وہ اسلام قبول کرلیتے تھے۔

ترکوں کا دباؤ: زیر مطالعہ زمانہ میں ترک شمالی ہندوستان میں اپنے زیر اثر علاقوں کی توسیع کی برابر کوشش کرتے رہے۔ گنگا کے میدانی علاقے میں ان کا دباؤ برابر محسوس کیا جارہا تھا۔ ان کی قزاولی کارروائیوں کا مقصد یہ تھا کہ راوی کے اس پار کے علاقے میں قدم جمایا جائے۔

(1) بقول بیہقی، احمد نیالتگین نے بنارس تک پیش قدمی کی تھی۔[15]

(2) مسعود کے متعلق کہا جاتا ہے کہ اس نے ہانسی فتح کرلیا تھا۔[16]

(3) مدن پال کے رہن میں واقع کتبہ میں یہ ذکر ہے کہ اس کے باپ گووند چندر نے ''اپنی بے مثل شجاعت سے ہمیرہ (ترکوں) کو مخالفت سے باز رکھا تھا۔[17]''

(4) بدایوں میں لکھن پال کے کتبہ میں اس کے مورث مدن پال کا اس حیثیت سے ذکر ہے کہ اس نے ''دیوتاؤں کے دریا'' (گنگا) میں ہمیراؤں کے حملوں کو ناممکن بنادیا تھا۔[18]

(5) کومارادیوی کے سارناتھ کے کتبہ میں گوند چندر (1114-55) کی یہ تعریف درج ہے کہ اس نے بنارس کو بدمعاش ترشکا جنگ بازوں سے محفوظ رکھا۔[19]

(6) مسعود سوم کے عہد میں حجیب تغاتگین نے گنگا کے پار اس علاقے تک پیش قدمی کی جہاں مسعود کے علاوہ اب تک کوئی نہیں گیا تھا۔[20]

(7) وجے چندر (1155-70) کی ہمیراؤں کے خلاف کارروائیوں کی بھی تعریف کی گئی ہے۔[21]

(8) وشالدیو کا دہلی سیوالک کا ستونی کتبہ مورخہ 1164 اس بادشاہ کا ذکر ملیچھوں[22] کے فاتح کی حیثیت سے کرتا ہے۔

(9) پرتھوی رائے اول کا ایک کتبہ مورخہ 1167 ہانسی کی قلعہ بندی کا ذکر کرتا ہے تاکہ ہمیرا کی پیش قدمی کو روکا جائے۔[23]

(10) مسعود سعد سلمان کے دیوان سے ظاہر ہوتا ہے کہ بدایوں، دہگان، قنوج، مالوہ اور کالنجر پر بعد کے غزنوی سلطانوں کے حملوں کا دباؤ خاص طور پر رہا۔[24]

(11) کراڈو (جودھپور) کے ایک کتبہ مورخہ 1178 میں یہ ذکر ہے کہ ایک عورت نے ترشکوں کی توڑی ہوئی مورتی کی جگہ پر ایک نئی مورتی بنوائی تھی۔[25]

(12) واہبوئے کا کتبہ گجرات کے چالوکیہ بھیملہ خاتون کے لاون پرشاد 1200 کے لگ بھگ کی ایک ترک حکمراں کے خلاف کارگزاریوں کا ذکر کرتا ہے۔[26]

(13) سندھیا پہاڑی کے کتبہ میں ذکر ہے کہ لکھان (1164-94) کے لگ بھگ) نے ایک ترشک کو شکست دی تھی اور ایک طلائی دروازہ تعمیر کیا تھا۔[27]

بعد کے غزنوی دو شعرا مثلاً سید حسن مسعود سعد سلمان، رونی، ثنائی وغیرہ کے کلام کے مطالعے سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان ممالک میں اکثر ہندوستان کا ذکر ہوتا تھا اور ہندوستان پر حملے بعد کے غزنوی سلطانوں کا معمول بن گئے تھے۔

بارھویں صدی کے آخری ربع اور تیرھویں صدی کے اوّل ربع میں غوریوں کی بڑے پیمانے پر جنگی کارروائیاں نہ اچانک تھیں اور نہ غیر متوقع۔ درحقیقت یہ پچھلی ڈیڑھ صدی کے ان چھوٹ پٹ حملوں کے سلسلے کی آخری کڑی تھیں جس کے دوران مختلف علاقے فتح ہوئے اور پھر قبضہ سے نکل گئے اور سیاسی اقتدار کی توسیع اور پھر پسپائی ہوئی اس طور پر غزنوی سلطنت کی سرحدوں میں تغیر ہوتا رہا۔

غوریوں کی فتح کے قبل کی مسلم آبادیات: بعد کے غزنوی دور میں جب کہ راجپوت سیاسی اقتدار کی توسیع کا مقابلہ جم کر کر رہے تھے (اس وقت) مسلم تاجر، سوداگر، بزرگ اور صوفی باامن طور پر ملک میں داخل ہوئے اور متعدد اہم مقامات پر بس گئے۔ اول تو ذات کی پابندیوں کی وجہ سے اور پھر ہندوستانی عوام سے تعلقات قائم کرنے کی سہولت کے خلاف سے یہ مسلم مہاجرین قلعہ بند شہریوں کے باہر آبادی کے نچلے طبقوں کے ساتھ رہتے تھے۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شمالی ہندوستان پر غوریوں کی فتح کے تقریباً نصف صدی قبل سے ہی چھوٹ پٹ طور سے مسلم تہذیبی گروہ (Gulture-group) ملک کے اندر قدم جما چکے تھے۔ بنارس کے متعلق ابن اثیر لکھتا ہے کہ اس علاقے میں محمود سبکتگین کے عہد سے ہی مسلمان موجود تھے جو کہ اسلام کے مطیع تھے اور عبادات اور کار خیر میں مستعد[28] بہرائچ میں سپہ سالار مسعود غازی کا مزار تھا جو کہ سلطان محمود کی فوج کا ایک سپاہی تھا۔[29] غزنوی حملوں اور شمالی ہندوستان پر فتح کے طویل درمیانی عرصے میں ان کے نام اور ان کے مزار کا قائم رہنا ایسی حقیقت ہے، جس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ کچھ مسلم آبادی رہی ہوگی جو مزار کی دیکھ بھال کرتی رہی اور جس نے سالار کی شہادت کی روایت کے بعد کی نسلوں کے لیے محفوظ رکھا۔ شیخ معین الدین چشتی ترائن کی دوسری جنگ سے قبل اجمیر آئے۔[30] اور ان کی گہری انسان دوستی اور پاک طریقۂ حیات نے ان کے گرد عقیدت مندوں کا ایک گروہ جمع کردیا۔ ''مشارق الانوار'' کے مشہور مصنف رضی الدین حسن صغانی کی پیدائش بدایوں میں اس شہر پر غوریوں کی فتح کے بہت قبل ہوئی۔[31] قنوج میں مسلمانوں کی نوآبادی کے وجود کی

تصدیق ابتدائی عرب تذکروں سے ہوتی ہے۔

صوبہ یوپی اور بہار کے بعض شہروں میں مسلمانوں کی چند عبادت گاہیں ہیں جو مقامی روایات کے مطابق غوریوں سے قبل کے عہد کی ہیں۔ بدایوں میں میراں ملہم کا مزار [32]، بلگرام میں خواجہ مجد الدین کا مزار [33]، بلگرام میں ملاواں کے اونچا ٹیلہ میں واقع مزار [34] گوپامئو میں عظمت ٹولہ میں لال پیر کی درگاہ [35]، بدایوں میں بلسی روڈ میں واقع قبرستان [36]، اناؤ میں ایسواں میں واقع گنج شہیداں [37]، بہار میں حاجی پور کے نزدیک جروہا میں واقع مزارات منیر میں بڑی درگاہ کے مغربی دروازہ کے قریب امام تقی فقیہہ کا مزار ج [38]، یہ سب کے سب غوری دور کے قبل کے زمانے کے جانے جاتے ہیں اور ان شہروں کے بعض خاندان کے افراد کا دعویٰ ہے کہ ان کے بزرگ اسی زمانے میں یہاں آکر بس گئے تھے۔ ان کے یہ دعوے صحیح یا غلط ہوسکتے ہیں لیکن ان مزارات کی تاریخی واقعیت (Historiety) کے متعلق مقامی روایات کو نظرانداز نہیں کیا جاسکتا۔ خاص کر ایسی صورت میں جب کہ ان علاقوں میں مسلم نوآبادیوں کی موجودگی کی تصدیق دوسرے ذرائع سے بھی ہوتی تھی۔

یہ نوآبادیاں ہندوستان میں جس صورت حال کے تحت قائم ہوئیں ان کو مختصراً بیان کردینا مناسب ہوگا۔ بیرونی ملکوں کے ساتھ ہندوستان کے تعلقات کی ابتدا وادیِ سندھ کی تہذیب کے زمانے سے ہی کی جاسکتی ہے۔ ہندوستان میں بعض ایسی اشیا تیار ہوتی تھیں مثلاً شکر، روئی، رنگنے والی اشیا خاص طور پر نیل اور کتھا جن کی سردممالک میں زبردست مانگ تھی اور بیرونی تاجران چیزوں کے لیے مقامی خریداروں سے زیادہ قیمت دینے کو تیار تھے۔ دوسری جانب ہندوستان کو بھی بیرونی چیزوں کی ضرورت تھی، مثلاً عمدہ نسل کے گھوڑے، خشک میوے، موتی، مختلف قسم کے قیمتی پتھر (بدخشاں کا لعل اور فارس کا فیروزہ) فارسی ادب کی شہادت کے مطابق اوائلِ عہد وسطیٰ کے ایک عمدہ طور پر مسلح سپاہی کو اپنے لیے ایک تلوار، ایرانی کمان اور تاتاری نیزہ کا انتظام کرنا پڑتا تھا۔

منوسمرتی اور اس طرح کی دیگر کتابوں میں ہندو مذہب کے جو خود عاید کردہ عقائد ہمیں ملتے ہیں ان کے مطابق اونچی ذات کے ہندوؤں کو یہ حکم ہے کہ وہ اس علاقے تک محدود رہیں جہاں مونج گھاس اُگتی ہے اور جہاں ہرن چرتے ہیں۔ اس کو سمندر پار نہیں جانا چاہیے اور نہ ایسی جگہ جہاں ذات کے باہر کے لوگ حکمراں ہوں۔ منوسمرتی کے مطابق ذات سے باہر کے لوگوں میں سب سے ادنیٰ گروہ، یوواناؤں، پہلواؤں اور ترشکوں کا ہے۔ (یونانی، ایرانی اور ترک) قبل کے عہد کے ہندو مذہب کے توسیعی رجحانات کسی طور پر منوسمرتی کے زمانے کی تنگ نظری میں تبدیل ہوگئے۔ اس بحث سے ہمیں یہاں غرض نہیں لیکن ہندوستان کے تمام حصوں (سوائے کشمیر) میں عرب تاجروں کی موجودگی اور فارس اور مرکزی ایشیا میں ہندوستانی تاجروں کی غیرموجودگی سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ منوسمرتی کے احکامات موثر تھے اور یہ کہ ہندوؤں کے تاجر طبقے کو، جو عہدِ وسطیٰ میں اپنے کام میں بہت کارگزار اور لائق تھا۔ تجارتی درآمد اور برآمد کا کام غیرملکیوں کے حوالے کرنا پڑا تھا۔

ڈاکٹر حبیب اللہ لکھتے ہیں کہ ''اپنی تجارت کو فروغ دینے کے خواہش مند راجگان ان لوگوں کے ساتھ فراخدلی کا برتاؤ کرتے تھے جو کہ مہذب دنیا کے خاص خاص تجارتی راستوں پر قابض تھے۔ لانبے، گھیردار عباؤں میں ملبوس اور داڑھی رکھنے والے یہ لوگ مقررہ وقتوں پر عبادت کے لیے ایک مستطیل نما عمارت میں جمع ہوتے تھے جس میں کوئی مورتی نہیں ہوتی تھی اور یہ لوگ ذات کے کسی اصول کے پابند نہ تھے۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ (مقامی لوگوں میں) اجنبیوں اور ان کے معمولات پر حیرت کا احساس کم ہوتا گیا۔ انھوں نے اپنی نوآبادیات قائم کرلیں اور ان کی تعداد بڑھتی گئی۔ یہاں تک کہ یہ مقامی آبادی کا ایک لازمی حصہ بن گئے یدتا جک نوآبادیاں رائے کی اجازت سے اکثر بڑے شہروں کے مضافات میں قائم ہوئیں۔ رائے نے مسلمانوں کو اپنے مکانات، مسجدیں، مدرسے، گودام اور دکانیں وغیرہ بنانے کی اجازت دی اور قبرستان کے لیے بھی ایک جگہ دی۔ ان نوآبادیوں کے علاقے میں ترقی ہوئی۔ کسی حد تک یہ آبادی میں اضافے کی وجہ سے ہوا۔ شیخ علی ہجویری کے اس جملے سے کہ ان کالاہور آنا کچھ ''ناخوشگوار لوگوں'' (غالباً قبیلہ کے ترک) کی وجہ سے ہوا۔ یہ ظاہر ہوتا ہے کہ وہ لوگوں کے ایک ایسے بڑے طبقے کی نمائندگی کررہے تھے جن کو فارس اور وسط ایشیا کے متواتر سیاسی بحران نے ہندوستان جانے پر مجبور کردیا تھا جہاں وہ سکون کے ساتھ گزر اوقات کرسکتے تھے۔ بعض مثالیں جن کا تذکرہ محفوظ رہ گیا ہے یہ ثابت کرتی ہیں کہ ان نوآبادیوں نے تہذیبی بلندی حاصل کی۔ ان میں درسی کتابیں عربی زبان میں تھیں۔ تعلیم کا ذریعہ شاید فارسی زبان تھی مگر ان میں رہنے والوں کی مادری زبان مقامی تھی۔

اگر ہم نفس مضمون سے تجاوز کرکے دہلی کے دو ایسے ہندوستانی مسلمانوں کی سوانح حیات کو سرسری طور پر پیش کریں جن میں سے ایک کی پیدائش غوری فتوحات کے قبل اور دوسرے کی دہلی پر غوری فتح کے فوراً بعد ہوئی تو یہ بے جا نہ ہوگا چونکہ اس سے ہمیں ان نوآبادیوں میں حالات زندگی کا صحیح اندازہ حاصل ہوگا۔

مولانا رضی الدین حسن صاغانی [39]: اس مشہور عالم حدیث اور ''مشارق الانور'' کے مصنف کی پیدائش بدایوں میں اس شہر پر ترکوں کے قبضے کے بہت قبل ہوئی تھی۔ ان کی ابتدائی تعلیم ان کے پیدائشی شہر میں ہوئی۔ ایسا اندازہ ہوتا ہے کہ وہاں مسلم مذہبی امور میں تعلیم کے اعلیٰ انتظامات مہیا تھے۔ ان کے طالب علمی کے دور کا ایک واقعہ جو مولانا کبھی نہیں بھول سکے یہ تھا کہ

ایک مرتبہ انھوں نے اپنے استاد سے ایک حدیث کا مجموعہ مختص عاریتاً طلب کیا تھا مگر استاد نے دینے سے انکار کر دیا اس سے ان کی غیرت اور شوقِ تعلیم کو دھکا لگا۔ شاید یہ واقعہ اس زمانے میں کتابوں کی کمی کی وجہ سے ہوا ہوگا۔ بعد میں غوری کی فتح کے بعد وہ کوئل (علیگڑھ) پہنچے اور وہاں کے مشرف کے نائب مقرر ہوئے۔ ایک روز مشرف کی کسی احمقانہ بات پر مولانا مسکرا دیے۔ مشرف نے بے عزتی محسوس کر کے روشنائی کی دوات مولانا پر پھینک ماری۔ مولانا نے رنجیدہ ہو کر نوکری چھوڑ دی اور کہا کہ ''جاہلوں کے تحت کام نہیں کرنا چاہیے۔''

بعد میں وہ ایک سوختہ۔مالانہ پر کوئل کے گورنر کے ایک لڑکے کے استاد مقرر ہوئے مگر بہت دنوں تک اس ملازمت میں نہیں رہے۔ اور بڑے پیمانے پر ہندوستان کے اندر سفر کا سلسلہ شروع کیا۔ ان کے علم و قابلیت کی وجہ سے ان کی شہرت ہوئی اور وہ جہاں بھی گئے ان کی عزت کی گئی۔ جب وہ ناگپور پہنچے تو ممتاز علما مثلاً قاضی حمید الدین اور قاضی کمال الدین ان کے گرد جمع ہوئے اور ان سے درخواست کی کہ ان کو حدیث کی تعلیم دیں۔ مولانا رضی الدین اپنی ایک کتاب مصباح الدجہ ناگور کے عالموں کو پڑھاتے تھے اور ان کو اسناد تعلیم بھی تقسیم کرتے تھے۔ ایک مقامی شخص نے ان سے تصوف کی تعلیم کی درخواست کی مگر مولانا نے معذرت کی اور کہا کہ ''میں بہت مصروف ہوں، چونکہ ناگور کے لوگ ان دنوں مجھ سے حدیث کی تعلیم حاصل کر رہے ہیں، فی الحال مجھے فرصت نہیں کہ آپ کو تصوف کی تعلیم دوں۔ اگر آپ اس کے خواہش مند ہیں تو آپ میرے ساتھ غیر مسلم علاقوں کے سفر میں چلیں، وہاں اتنا ہجوم نہ ہوگا اور تب میں آپ کو تعلیم دے سکوں گا۔''

مولانا ناگور سے جالور اور گجرات تشریف لے گئے وہاں کے حالات ایسے تھے کہ وہ آزادانہ طور پر باہر نہیں نکل سکتے تھے۔ لہٰذا انھوں نے اپنا لباس تبدیل کر دیا اور خفیہ طور پر گھومنے لگے۔ سفر کے دوران انھوں نے متذکرہ بالا شخص کو تصوف میں تعلیم دی۔ بعد میں وہ لاہور گئے اور پھر وہاں سے بغداد جا پہنچے۔ ان کی علمیت کی وجہ سے خلیفہ کی توجہ ان کی جانب ہوئی اور ان کو ایک سرکاری ملازمت پیش کی گئی۔ 1220 میں خلیفہ الناصر نے ان کو اپنے سفیر کی حیثیت سے التمش کے دربار میں بھیجا۔ چند سال بعد ان کو پھر دہلی آنے کا اتفاق ہوا اور وہ 1239 تک وہاں رہے۔ شیخ نظام الدین نے ایک مجلس میں کہا تھا کہ ''ان دنوں دہلی میں بہت سے علما موجود تھے۔ مولانا رضی الدین علم حدیث میں ان سبھوں سے زیادہ واقفیت رکھتے تھے اور دیگر شعبہ جات علم میں بھی ان سے کم نہ تھے۔

اس بات سے کہ بدایوں میں مسلم حکومت کی ابتدا کے بہت قبل ہی وہاں ایک نوجوان مسلم طالب علم کو مذہبی مضامین میں تعلیم دینے کی سہولتیں تھیں۔ یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ان مسلم نوآبادیوں کی جڑیں گہری ہو چکی تھیں اور ان میں ثقافتی ادارے نشوونما پا رہے تھے۔

شیخ حمید الدین صوفی[40]: شیخ معین الدین چشتی اجمیری کے یہ مشہور شاگرد، دہلی میں معز الدین کا قبضہ ہونے کے بعد پہلے طفل تھے جس نے اس شہر میں آنکھ کھولی۔ ان کی اوائل زندگی بڑی عیش و عشرت کی تھی لیکن شیخ معین الدین کے حلقۂ شاگردی میں شرکت کر لینے کے بعد انھوں نے پچھلے گناہوں سے توبہ کر لی اور اطاعت و فقر کی زندگی اختیار کر لی۔ شہر کی ہماہمی سے دور ناگور کے نزدیک سوال نامی ایک بستی میں انھوں نے سکونت اختیار کر لی اور کاشتکاری شروع کر دی۔ ان کی جو بھی ضروریات تھیں اور یہ چند من غلہ اور چند گز موٹے بنے ہوئے کپڑوں سے زیادہ نہ تھیں۔ وہ خود مہیا کرتے تھے اور حکومت وقت سے کسی قسم کے تعلق سے پرہیز کرتے تھے۔

ناگور میں ان کی زندگی سے ہمیں ہندوستان کے دیہی علاقوں میں مسلمانوں کی روزمرہ زندگی کے اوّلین نمونے مہیا کرتی ہے۔ مٹی سے بنے ہوئے ایک چھوٹے مکان میں وہ رہتے تھے اور ایک بیگھے زمین کی کاشت سے کسی طور گزر اوقات کرتے تھے۔ فصلوں کو بدل بدل کر کاشت کرنے کا طریقہ اس زمانے میں معلوم نہ تھا اور وہ اپنی زمین کا ایک نصف ایک فصل میں جوتتے تھے اور دوسرا اگلی فصل میں۔ وہ ایک عام ہندوستانی کسان کی طرح کپڑے پہنتے تھے اور جسم کے بالائی اور زیریں حصوں کو ڈھانپنے کے لیے دو الگ الگ کپڑے کے ٹکڑے استعمال کرتے تھے۔ ان کے گھر میں ایک گائے تھی جس کو وہ خود دوہتے تھے۔ ان کی اہلیہ، جو ایک نیک اور صوفی منش خاتون تھیں، اپنا وقت عام کسان عورتوں کی طرح کھانا پکانے اور کپڑا بننے میں صرف کرتی تھیں۔ ان دیہاتوں کی طرح جن کے درمیان وہ رہتے تھے۔ شیخ حمید الدین کھانے میں صرف ترکاری اور سبزی استعمال کرتے تھے۔ گوشت کو وہ اس قدر ناپسند کرتے تھے کہ انھوں نے اپنے شاگردوں کو اس بات سے منع کر دیا تھا کہ ان کے انتقال کے بعد ایصال ثواب کے سلسلے میں کھانے تقسیم کرنے میں گوشت کا استعمال نہ کریں۔ ان کے خاندان میں ہندوی زبان میں بات چیت ہوتی تھی اور ماں کو مائی اور برادر کو بھائی پکارا جاتا تھا۔

ان کی طاعت و فقر سے متاثر ہو کر ناگور کے مقطع (حاکم) نے ان کو کچھ نقد اور زمین پیش کی۔ شیخ نے معذرت کی اور انکار کر دیا۔ مقطع نے التمش کو خبر دی اور اس نے ایک فرمان کے ذریعے 500 نقرئی اور ایک گاؤں عطا کیا۔ انھوں نے بطور آزمائش اپنی بیوی کو مطلع کیا تاکہ مادّی آرام و آسائش کی زندگی گزارنے کے اس موقع کے متعلق ان کے تاثرات کا اندازہ ہو۔ اس وقت ان لوگوں کی تنگدستی کا یہ عالم تھا کہ ان کی بیوی کے سر پر ایک پھٹا ہوا دوپٹہ تھا اور

ان بزرگ کے جسم پر ایک گندہ زریں جامہ تھا۔ ان کی بیوی نے جواب دیا۔ "اے خواجہ کیا آپ اس تحفہ کو قبول کر کے برسوں کی اطاعت وعبادت پر پانی پھیرنا چاہتے ہیں؟ آپ فکرمند نہ ہوں میں نے دو سیر سوت کات لیا ہے۔ آپ کے لیے ایک زریں جامہ اور میرے لیے دوپٹہ اس سے تیار ہو سکتا ہے۔" شیخ حمیدالدین اس جواب سے بہت متاثر ہوئے اور مقطع کو مطلع کر دیا کہ انھوں نے یہ عطیہ نہ قبول کرنے کا فیصلہ کرلیا ہے۔

حواشی:

1. قدیم ہندوستان میں ریاست اور حکومت (The State and Government in Ancient India) بنارس 1949 ص: 225
2. اے۔ایس۔ الٹیکر، راشٹرکوٹ حکمراں اور ان کا عہد، پونہ، 1934 ص: 265
3. رجت رنگنی۔ (مترجم) 1 سٹن VIII 1028
4. قدیم ہندوستان میں ریاست اور حکومت، ص: 12
5. کتاب الہند، ترجمہ Sachau، جلد اول، ص: 100-101
6. ایضاً، جلد اول، ص 100-101
7. ایضاً، جلد اول ص: 104، مگر ہندو فلسفیوں کا عقیدہ مختلف تھا۔ ان کے مطابق نجات ہر ذات کے لیے بلکہ تمام نسل انسانی کے لیے مشترک تھی۔ بشرطیکہ ان کے حصول کی نیت صاف ہو۔
8. ایضاً جلد 2، ص: 136
9. ایضاً، جلد 1، ص: 125
10. جنرل آف علی گڑھ، ہسٹاریکل انسٹی ٹیوٹ اپریل 1940 ص 86
11. کتاب الہند جلد 1، ص: 101، یہاں تمام پیشوں کی مکمل فہرست تصور نہیں کی جاسکتی جو کہ اس وقت ہندوستان میں مروج ہوں گے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ البیرونی نے اپنے تبصروں کی وضاحت کے لیے صرف چند قسم کے پیشہ وروں کا ذکر کیا ہے جنھیں اس نے ان علاقوں میں دیکھا تھا جہاں اس کو رہنے کا اتفاق ہوا تھا۔ پیشہ وروں کی زندگی مختلف علاقوں میں علاحدہ علاحدہ طرز کی رہی ہوگی۔ چونکہ اس پر مختلف تمدنی روایات اور انتظامی تشکیل کا اثر تھا۔
12. کتاب الہند، جلد 1، ص: 103
13. ایضاً ص 101-102
14. منوسمرتی کے مندرجہ ذیل اشلوک گرچہ ان کی تالیف ایک ہزار سال سے زیادہ عرصہ قبل ہوئی تھی۔ البیرونی کے بیان کیے ہوئے حالات کے ضمن میں قابل توجہ ہیں اور یہ بخوبی فرض کیا جا سکتا ہے کہ رائے عامہ کی لہر منو کے اصولوں کی مطابقت میں بہہ رہی تھی۔ 51، لیکن سیدا پچاؤں کی جھونپڑیاں گاؤں کے باہر ہوں گی۔ ان ہی کو اپنا چترینا دینا چاہیے اور ان کی ملکیت سور اور کتے ہوں گے۔" (منوسمرتی باب 10)
15. کتاب الہند، جلد 2، ص 102:3
16. بیہقی (مولفہ غنی اور فیاض) ص: 402
17. ایضاً ص: 530-35
18. 16-XVIII;IA
19. 64-I-:E.I.
20. 319-IX-:E.I.
21. منہاج-22
22. 119-IV-:E.I.
23. 218-XXX-I.A.
24. دیوان مسعود سعد سلمان (مولفہ رشید یاسمی) صفحات 219,247,28,170,71,319,307,226-65
25. محکمۂ آثار قدیمہ، مغربی سرکل رپورٹ 1906-7 ص 42 (Pr. Reb. Arch. Surveu W.C. 1906-7, 42)
26. 1-26-E.I.
27. IX-69-E.I.
28. ایلیٹ اور ڈاؤسن (Elliot and Dowson) جلد دوم، ص: 251
29. برنی، تاریخ فیروزشاہی، ص: 491

مزید دیکھیے خسرو کی "اعجاز خسروی" جلد دوم، ص: 155

سالار مسعود کا ذکر غزنوی کی کسی ہم عصر تحریر میں نہیں ملتا۔ بیہقی کے بقول سلطان محمود نے گنگا پار کرنے کی ممانعت کر دی تھی۔ سالار مسعود کی سلطان محمود کے ساتھ نسبت شاید بعد کی افسانہ طرازی ہو۔ ممکن ہے کہ وہ گیارھویں نصف صدی کے اواخر میں ملک میں داخل ہوا ہو۔

30. سیرالاولیا ص: 46
31. ان کی مختصر سوانح کے لیے آگے کے اوراق ملاحظہ کیجیے۔
32. کنزالتاریخ (بدایوں کی تاریخ از رضی الدین) ص: 51-53
33. ڈسٹرکٹ گزیٹیر (District Gazetteer) ہردوئی، 41، ص: 178
34. ایضاً ص: 130
35. ایضاً ص: 187
36. ڈسٹرکٹ گزیٹیر، بدایوں، جلد 15 ص 190
37. ڈسٹرکٹ گزیٹیر، اناؤ، جلد 38، ص: 118
38. ملاحظہ ہو حسن عسکری کا مضمون Historical Significance of Islamic Mysticism in Medieval Bihar (Hist. Miscellany 10-11)
39. سوانحی حالات کے لیے دیکھیے "فوائد الفواد" ص: 1-4، یعقوبی، "معجم الادبا"، جلد سوم ص: 211

ابن شاکر، "فوائد الوفایات"، جلد اول، ص: 133؛ "سرور الصدور" (قلمی) مزید دیکھیے "تیرھویں صدی کے ہندوستان میں مذہب و سیاست"، ص: 152-54 اور "عربی ادب میں ہندوستان کی دین"۔

40. سوانحی تفصیل کے لیے دیکھیے "سرورالصدور" (قلمی) "سیرالاولیا" ص: 156-64، "سیرالعارفین" ص: 13-14 "اخبارالاخیار"، ص: 29-36، مزید دیکھیے "نظامی مذہب اور سیاست" ص: 185-87

□□□

شمس الرحمٰن فاروقی

(ہماری مطبوعات سے)

دیباچہ — نغماتِ حریت

ہندوستان میں ایسٹ انڈیا کمپنی، اور پھر تاج برطانیہ کی حکومت نے جہاں بہت سی اچھی بری چیزیں پیدا کیں ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ اس نے ملک کے ادیبوں میں قوم پرستی کے جذبات پیدا کیے۔ یہاں لفظ ''قوم'' سے مراد وہ مبہم، لیکن بے حد حقیقی وجود ہے جسے ہم ''ہندوستانی قوم'' کہتے ہیں۔ یہ بات تو ظاہر ہے کہ ہندو تہذیب میں ''قوم'' کا کوئی تصور نہیں، اور اسلامی تصور حیات میں ''قوم'' کی جگہ ''امت'' کا تصور ہے، یعنی وہ سب اگلے پچھلے لوگ جو پیغمبر اسلام علیہ السلام کے پیرو ہیں، ان کا مجموعہ ''امت'' کہلاتا ہے، اور کسی مقررہ وقت پر جو لوگ خود کو پیغمبر اسلام کی ''امت'' شمار کرتے ہیں، انھیں ''ملت اسلامیہ'' کہا جاتا ہے۔ رنگ، نسل، یا زبان کے تاملات سے ماورا ''ملت'' یا ''امت'' کا یہ تصور آج کے ذہنوں میں ایک بین الاقوامی وحدت کا تاثر پیدا کرتا ہے اور یہ بھی ثابت کرتا ہے کہ جغرافیائی، یا لسانی، یا مذہبی، یا سیاسی بنیادوں پر قائم کسی ''قوم'' کی گنجائش اس وحدت میں نہیں ہے۔

تو پھر ہم نے ''ہندوستانی قوم'' کا تصور کہاں سے حاصل کیا، اور برصغیر کی جدوجہد آزادی کی تاریخ میں ''ہندوستانی قوم'' کے اس تصور کی کیا اہمیت ہے؟ یہاں پہلی بات تو یہ ہے کہ ''قوم'' ایسا سماجی وجود ہے جو مختلف قسم کے افراد پر مشتمل ہو لیکن جن کے انسانی تصورات (آزادی، حاکمیت، سالمیت، بنیادی حقوق، نجی اموال و املاک کا احترام، سماجی اداروں کی ضرورت اور معنویت، امن اور جنگ قائم کرنے کے طریقے) کم و بیش ایک ہوں، یا اگر کم و بیش ایک نہ بھی ہوں تو ان میں مطابقت پیدا ہو سکتی ہو، یا پیدا کر لی گئی ہو۔ ہندوستانی سماج میں یہ تصور وحدت سبک ہندی کی فارسی شاعری، پھر اردو شاعری، خیال کی موسیقی، اور سب سے بڑھ کر صوفیوں، درویشوں، اور سادھو سنتوں کی بدولت پیدا ہوا۔ اٹھارھویں صدی آتے آتے یہ تصور اس قدر مقبول عام تھا اور اتنی دور دور تک پھیل گیا تھا کہ مراٹھوں کے علاقے میں شاہ تراب خطائی 1740 کے آس پاس مراٹھی سنت گیانیشور کی طویل نظم ''من سمجھاون'' کا منظوم اردو ترجمہ کرتے ہیں تو بنارس میں ایک برہمن موسیقی کی ایک سنسکرت کتاب کا ترجمہ فارسی میں کرتا ہے (1719)، اور اس صدی کے ربع آخر میں رسلین بلگرامی اودھی زبان اور اردو رسم الخط میں معشوق کا سراپا لکھتے ہیں جس میں اسلامی اور ہندو دونوں تہذیبوں سے مضامین مستعار لیے گئے ہیں۔ اسی طرح 1729 میں سوائی راجا جے سنگھ نے علم ہیئت پر البرجندی کی ایک کتاب کا ہندی (یعنی آج کی زبان میں اردو) ترجمہ ایک مسلمان اور ایک ہندو عالم کی مدد سے تیار کرایا۔

یہ تاریخ کی بوالعجبی ہے کہ اٹھارھویں صدی ہی میں ہندوستان نے انگریزوں کی بالادستی کے قیام و استقلال کے تکمیلی مناظر دیکھے۔ ٹیپو سلطان کی شہادت (1799) اور قلعۂ دہلی میں بادشاہ شاہ عالم کا انگریزوں کی ''حفاظت'' میں آجانا (1803)، ان واقعات نے ہندوستان کے سیاسی زوال پر حتمی مہر لگادی:

اعتبار صبر و طاقت خاک میں رکھوں ظفر
فوج ہندوستان نے کب ساتھ ٹیپو کا دیا
(بہادر شاہ ظفر، دیوان اول)

توڑ جوڑ آوے ہے کیا خوب نصاریٰ کے تئیں
فوج دشمن سے وہیں لیتے ہیں سردار کو توڑ
(مصحفی، دیوان ہشتم)

اہل ہند کے دل و دماغ میں انگریز کے خلاف غصے اور نفرت کی جو لہر دوڑی اس نے رفتہ رفتہ احتجاج اور پھر قومی شعور حریت کی شکل اختیار کر لی۔ یہی قومی شعور آہستہ آہستہ ''ہندوستانی قوم'' کے تشخص میں بدل گیا۔ اس تشخص کی تشکیل میں اردو شعرا اور اردو کے لوک گیت نگاروں نے بہت اہم کردار ادا کیا۔ اس بات کے پیش نظر، کہ اردو شعرا کے یہاں قومی شعور حریت کا احساس اور انگریز کی چیرہ دستیوں پر احتجاج اٹھارھویں صدی ہی سے جھلکنے لگتا ہے، ہم یہ کہنے میں حق بجانب ہوں گے کہ ہندوستانی قومی شعور کی بیداری، انگریز کو غیر قوم اور بیرونی حاکم سمجھنا، اور ملک پر انگریزی تسلط کے سیاسی مضمرات کا احساس، ان سب باتوں میں اردو ادب کو ہندوستان کی بقیہ تمام ادبی روایتوں پر تفوق زمانی حاصل ہے۔ کیفیت اور کمیت کے اعتبار سے بھی اردو ادب کا پلہ سب پر بھاری پڑے گا۔ مصحفی نے ''مجمع الفوائد'' نام کا ایک چھوٹا سا فارسی

''نغمات حریت'' سے ماخوذ، انتخاب و ترتیب: شمس الرحمن فاروقی/صفحات 274، قیمت: -/219

نوٹ: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی جانب سے طلبہ اور اساتذہ کے لیے بالترتیب 45% اور 40% کی خصوصی رعایت دی جاتی ہے۔ تاجران کتب کو قومی اردو کونسل کے ضوابط کے مطابق رعایت دستیاب ہے۔
ادارہ

رسالہ اپنے حالات کے بیان میں لکھا تھا۔ اس کی تاریخ نہیں متعین ہو سکی ہے، لیکن اغلب ہے کہ یہ 1800 کے آس پاس لکھا گیا ہوگا۔ اس رسالے میں مصحفی ایک جگہ صاف صاف لکھتے ہیں کہ ہمارے ملک کی تقدیر اسی وقت بدلے گی اور اس کے حالات میں اصلاح اسی وقت ہوگی جب یہ ملک انگریزی تسلط سے آزاد ہوگا۔ میرا خیال ہے کہ انگریز حاکم کے خلاف براہ راست سیاسی احتجاج کی ہندوستانی ادب میں یہ پہلی مثال ہے۔ وقت کے ساتھ ساتھ اردو شاعری میں احتجاج کی آواز بڑھتی جاتی ہے اور پھر نعرہ و دعوت انقلاب کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔

سراج الدولہ کے ماتم میں راجا رام نرائن موزوں نے غزل کے استعاراتی رنگ میں (1757) لکھا تھا:

غزالاں تم تو واقف ہو کہو مجنوں کے مرنے کی
دوانہ مر گیا آخر کو ویرانے پہ کیا گزری

چند ہی سال بعد جرأت نے سراج الدولہ کے غاصب جانشینوں کے بارے میں صاف صاف بے استعارہ لکھا لیکن تشبیہ زبردست لائے، رباعی:

سمجھے نہ امیر ان کو کوئی نہ وزیر
انگریز کے ہاتھ اک قفس میں ہیں اسیر
جو کچھ وہ پڑھائیں سو یہ منھ سے بولیں
بنگالے کی مینا ہیں یہ پورب کے امیر

ہم اکثر بھول جاتے ہیں کہ 1857 کے علاوہ بھی کئی مواقع ہماری تاریخ میں ایسے ہیں جب اہل ہند نے انگریز کے خلاف تلوار اٹھائی۔ بنارس اور بریلی اور ڈیلور کے واقعات تاریخوں میں درج ہیں۔ لیکن ان کے علاوہ بھی چھوٹے موٹے سورماؤں نے اپنے اپنے طور پر انگریز کے خلاف خونیں معرکے گرم کیے۔ انھی میں سے ایک جنگ سہارن پور میں پیش آئی جس میں ایک جانباز نے گھر اور قصبے والوں کے منع کرنے کے باوجود انگریز کے خلاف علم بغاوت بلند کیا اور بالآخر جام شہادت نوش کیا۔ یہ واقعہ غالباً 1820 کا ہے اور ایک اردو لوک گیت میں اسے امر کر دیا گیا ہے۔ یہ لوک گیت ہم نے زیر نظر انتخاب میں شامل کیا ہے۔

اسی طرح، اردو میں احتجاج اور اندوہ کے اظہار کی ایک انوکھی اور دردناک مثال ایک میواتی لڑکی سرون کے بارے میں لوک گیت ہے۔ اکبر شاہ ثانی کے زمانے میں انگریز ریزیڈنٹ ولیم فریزر (William Fraser) کی شہرت کچھ تو اس وجہ سے تھی کہ وہ اردو فارسی کا بہت ماہر اور ہندوستانی تہذیب کا بہت دلدادہ تھا۔ اس نے اپنے ہندو دوستوں کے احترام میں گائے، اور مسلمانوں کے احترام میں سور کھانا چھوڑ دیا تھا۔ لیکن پرسیول اسپیئر (Percival Spear) کے قول کے مطابق وہ زمینات کے محاصل وصول کرنے میں اس قدر سخت تھا کہ اس کے زمانے میں مضافات دہلی کے اکثر گاؤں ویران ہو گئے تھا۔ فریزر کی دوسری شہرت اس باعث تھی کہ وہ غریب غربا کی لڑکیوں کو بہ جبر اٹھوا منگاتا تھا اور انھیں اپنے حرم میں داخل کر لیتا تھا۔ سرون ایسی ہی ایک لڑکی تھی جس کی داستان الم ''فرنجن سرون'' نامی لوک گیت میں ملتی ہے۔ اس گیت کو سب سے پہلے آغا حیدر حسن دہلوی نے 1934 میں شائع کیا تھا اور کہا تھا کہ یہ اور اس طرح کے دوسرے کئی گیت انھوں نے اپنے لڑکپن میں سنے تھے۔ آغا صاحب نے لکھا ہے کہ یہ گیت کم از کم سو سال پرانا ہے۔ یہ بات بالکل صحیح معلوم ہوتی ہے کیونکہ آغا حیدر حسن کا مضمون 1934 کا ہے اور فریزر کا قتل اس سے ٹھیک سو سال پہلے 1834 میں ہوا تھا۔ پس ظاہر ہے کہ یہ گیت 1834 کے پہلے ہی وجود میں آیا ہوگا۔ اس گیت کو تبسم کاشمیری نے اپنے ایک حالیہ مضمون مطبوعہ ''دریافت'' اسلام آباد میں آغا حیدر حسن کے حوالے سے نقل کیا ہے۔ ہم اسے ان کے شکریے کے ساتھ شائع کر رہے ہیں۔

کئی دیگر لوک گیت جو اس کتاب میں شامل ہیں ان میں سے اکثر کی اطلاع ہمیں محمود فاروقی کے ذریعے پروفیسر شاہد امین سے ملی۔ شاہد امین ان دنوں جنگ آزادی کی لوک روایتوں پر کام کر رہے ہیں اور خاص کر پنڈت رام غریب چوبے نے جو لوک گیت جمع کیے تھے، شاہد امین نے انھیں اپنے مطالعے کا موضوع بنایا ہے۔ ایک پرانے انگریزی رسالے The Indian Antiquary کی مختلف اشاعتوں میں ایک انگریز افسر نے اردو کے کئی لوک گیت شائع کیے تھے۔ اس رسالے کے بہت سے اوراق ہمیں شاہد امین نے محمود فاروقی کے توسط سے مہیا کیے۔ ہم ان دونوں عزیزوں کے شکر گزار ہیں۔ ہم نے متعدد گیت ان اوراق سے منتخب کیے ہیں۔ ان میں جھانسی کی رانی کے بارے میں جو گیت ہے اس سے یہ ایک دلچسپ بات بھی معلوم ہوتی ہے کہ سبھدرا کماری چوہان کی مشہور نظم کا مصرع ترجیع:

خوب لڑی مردانی وہ تو جھانسی والی رانی تھی

اسی لوک گیت سے لیا گیا تھا۔ اور یہ کہنا شاید غلط نہ ہوگا کہ سبھدرا کماری چوہان کی نظم کو ہر دلعزیز بنانے میں اس مصرع ترجیع کا بڑا ہاتھ رہا ہے۔

کچھ لوک گیت ہمیں ''آزادی کے ترانے'' نامی ایک چھوٹے سے رسالے سے ملے۔ یہ رسالہ آزادی کی پچیسویں سالگرہ (1962) کے موقعے پر حکومت یوپی نے شائع کیا تھا۔ ہم حکومت یوپی اور اس وقت کے ڈائرکٹر محکمۂ اطلاعات کے بھی شکر گزار ہیں۔

لوک گیتوں کا ذکر میں نے کچھ تفصیل سے کیا ہے، اس کی دو وجوہ ہیں۔ ایک تو یہ کہ زیر نظر اردو کی قومی اور انقلابی شاعری کا غالباً پہلا مجموعہ ہے جس میں

لوک گیت بھی شامل ہیں۔ دوسری بات یہ کہ غیر اردو دانوں (اور بہت سے اردو والوں) کا تاثر یہ ہے کہ اردو میں لوک ادب نہیں ہے۔ یہ تاثر حقیقت سے بہت دور ہے اور اس انتخاب میں شامل گیت اس بات کا حتمی ثبوت ہیں کہ اردو میں لوک ادب کی وافر مثالیں موجود ہیں۔ یہاں میں یہ نکتہ بھی واضح کرنا چاہتا ہوں کہ ہم نے ''اردو'' سے صرف ''کھڑی بولی'' مراد لی ہے۔ لہٰذا ہمارے انتخاب میں اودھی، برج، بھوج پوری، بندیلی کھنڈی وغیرہ زبانوں کی تخلیقات کے گیت شامل نہیں ہیں، خواہ وہ اردو رسم الخط میں بھی یا صرف اردو ہی رسم الخط میں دستیاب ہیں۔

اس انتخاب میں 15 اگست 1947 کے بعد کا کوئی کلام شامل نہیں ہے۔ اس لزوم مالیلزم کے باعث کئی بہت اچھی نظمیں شامل ہونے سے رہ گئیں، لیکن یہ قربانی ہم نے اس لیے گوارا کرلی کہ اب جو کچھ اس انتخاب میں ہے اس کی تحریر یا تخلیق کے وقت صاحب تحریر یا صاحب تخلیق کو انگریزوں کی طرف سے عقوبت کا خطرہ تھا، اور یہ بات ان متون کی سچائی کو ثابت کرنے کے لیے کافی ہے۔ اگر راجا رام نرائن موزوں کی غزل کو 1757 کا فرض کیا جائے (اور اس مفروضے کے غلط ہونے کی وجہ بظاہر نہیں ہے) تو اس کتاب کے مشمولات کی تصنیف کا دوران دس کم دوسو برس ٹھہرتا ہے۔ ہر چند کہ ان میں بیسویں صدی کا حصہ سب سے زیادہ ہے، لیکن انیسویں صدی کی نمائندگی بھی اچھی خاصی ہے، اور اٹھارھویں صدی کے متون میں کمیت نہ سہی، لیکن کیفیت کے اعتبار سے وہ کتاب کے دوسرے متون سے کم رتبہ ہرگز نہیں ہیں۔

''فغان دہلی'' نام کی مشہور کتاب (1861) میں زیادہ تر نظمیں دہلی کی تباہی کے بارے میں ہیں، لیکن ان میں احتجاج و انتقاد تو کیا، صحیح معنی میں اندوہ بھی نہیں ہے، کیونکہ زیادہ تر نظمیں انگریزوں کو خوش کرنے، یا انگریز کی خوشنودی کو مد نظر رکھ کر لکھی گئی تھیں، اور بعض نے تو ہندوستانیوں اور اہل قلعہ ہی کو اپنی طعن و تشنیع کا ہدف بنایا ہے۔ ہم نے ایسی کوئی نظم کیا، کوئی ایسا شعر بھی شامل نہیں کیا ہے جس میں سیاہ قلب سامراج کی خوشامد، یا شمع انقلاب کے پروانوں پر نکتہ چینی کا خفیف شائبہ بھی ہو۔ زیادہ تر شہر آشوب بھی ہمارے انتخاب میں نہ آسکے کیونکہ ہر شہر آشوب کسی نہ کسی طرح شہر آشوب کی رسومیات کو پیش نظر رکھ کر لکھا جاتا ہے، لہٰذا شہر آشوب میں علامتی سچائی تو ہوتی ہے، لیکن تاریخی یا واقعاتی سچائی بہت کم ہوتی ہے۔ شہر آشوب میں جس طرح کے اندوہ یا برہمی کے جذبات کا اظہار ملتا ہے، ان کی بھی نوعیت رسومیاتی اور غیر شخصی ہوتی ہے، اور اسی لیے زیادہ تر شہر آشوب ہمارے مقصد کے لیے کارآمد نہیں ہیں، حتیٰ کہ بہادر شاہ ظفر سے منسوب شہر آشوب بھی نہایت عمومی مضامین کا حامل ہے۔ مجھے اس میں بہت شک ہے کہ یہ شہر آشوب، اور بہادر شاہ ظفر سے منسوب دو مشہور غزلیں واقعی بہادر شاہ کی تصنیف ہیں۔ لیکن بہادر شاہ ظفر سے منسوب شہر آشوب ظفر کی زندگی ہی میں متداول ہوگیا تھا اور جس میں کچھ مصرعوں میں انگریزوں کے خلاف اشارہ ہے۔ ملّا کمال لکھنوی کے شہر آشوب میں البتہ کچھ بند صاف صاف انگریزوں کے تسلط ہند کے خلاف ہیں لہٰذا ہم نے انھیں انتخاب میں شامل کرلیا ہے۔

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ ''ہندوستانی قوم'' کے تصور کی طرح ''قومی یک جہتی'' کا بھی تصور ہمارے یہاں جدید زمانے کی پیداوار ہے۔ یہ بات اس معنی میں صحیح ہے کہ ''یک جہتی'' کو قائم کرنے کی ضرورت اسی وقت ہوگی جب ایک سے زیادہ وجود ہوں جن کے درمیان یک جہتی مطلوب ہو۔ یعنی جب ''دو قومی نظریہ'' ہوگا تو ''قومی یک جہتی'' کی بھی بات اٹھے گی۔ انگریزوں کی آمد کے پہلے ہمارے یہاں ذات برادری کا بول ضرور بالا تھا، لیکن مذہبی بنیادوں پر ''قوموں'' کی تقسیم یا تفریق نہ تھی۔ ہندوستان میں بسنے والے سب لوگ ''ہندو'' یا ''ہندی'' کہے جاتے تھے (غالب تک نے خود کو ''ہندی'' کہا ہے) اور ان کی معاشرت اور بود و باش میں جو بات نمایاں تھی اسے ''یک جہتی'' نہیں بلکہ ''اتحاد'' سے تعبیر کیا جاسکتا ہے۔ چنانچہ ''بہار عجم'' میں ٹیک چند بہار نے لکھا ہے کہ ''ہندو'' کے معنی ہیں، ''ہندوستان کا باسی''۔ لیکن انھوں نے یہ بھی لکھا ہے کہ خان آرزو کا کہنا ہے کہ لفظ ''ہندو'' سے وہی ہندوستانی مراد ہیں جو مذہباً بھی ہندو ہوں۔

یہ بحثیں وسط اٹھارھویں صدی کی ہیں اور ان سے صاف ظاہر ہے کہ انگریزی راج کے بڑھتے ہوئے سائے تلے ہمارے لفظوں کے معنی بھی بدلنے لگے تھے۔ لفظ Gentoo کی تاریخ بھی اس کی ایک مثال ہے۔ یہ لفظ سترھویں صدی کے انگریزوں کے یہاں جنوبی ہند کے ساحلی علاقوں، اور پھر مشرق میں خلیج بنگال کے ساحلی خطوں میں بسنے والوں کے لیے مستعمل تھا۔ انگریزوں کو غالباً یہ دیکھ کر تعجب اور پریشانی ہوئی کہ سارے کے سارے ہندوستانیوں کو ''ہندی'' یا ''ہندو'' کہا جاتا ہے، درحالیکہ انگریز کے یہاں انسانوں کی پہچان مذہبی تفریق ہی پر مبنی تھی۔ شاید اس لیے انھوں نے Gentile (یہودی/عیسائی اصطلاح میں ''غیر یہودی'') کے قیاس پر لفظ Gentoo بنالیا، بمعنی ''اعلیٰ ذات کے، یا پڑھے لکھے مقامی غیر مسلم۔'' یہ لفظ انگریزوں کی تحریر و تقریر میں مدتوں مستعمل رہا اور جب ''ہندو/مسلم'' تفریق ملک میں قائم ہوگئی تو لفظ ''جنٹو'' اس طرح غائب ہوگیا کہ اب صرف چند مورخ ہی اس سے واقف ہیں۔

زیر نظر انتخاب میں انیسویں صدی کی کئی نظمیں ایسی شامل ہیں جن میں ہندو مسلم اتحاد کا مضمون ہے، یا پھر یہ مضمون ہے کہ انگریزوں کو بے دخل کرنے

کے لیے ہندوستان کے سب لوگوں کو متحد ہوکر کام کرنا چاہیے۔ بیسویں صدی میں آ یئے تو ہندو اور مسلمان شعرا (اور کئی فرضی نام بھی) اتحاد اور حریت کی نغمہ سرائی میں شانہ بہ شانہ نظر آتے ہیں۔ ''تیسری دنیا'' کی اصطلاح اس وقت ایجاد نہیں ہوئی تھی، لیکن اقبال کی چشم جہاں بیں نے ان مسائل اور صورت حالات کو دیکھ لیا تھا جن سے تیسری دنیا کو دوچار ہونا تھا۔ ان کی نظم ''شعاع امید'' (1935) تیسری دنیا، بالخصوص ہندوستان کی بیداری اور مغرب کی مقابل تیسری دنیا کی آزاد اور مثبت شخصیت اور وجود کی تصدیق و استقلال کا ترانہ کہی جاسکتی ہے۔

پڑھنے والوں کی سہولت کا لحاظ رکھتے ہوئے ہم نے تمام مشمولات کو شعرا کے تخلص یا نام کے اعتبار سے حروف تہجی میں ترتیب دیا ہے۔ کتاب کے چار حصے ہیں:

(1) احتجاج، انتقاد، اندوہ

(2) جنگی معرکے

(3) قومی یک جہتی اور ملک کی آزادی

(4) جدو جہد آزادی اور انقلاب

ہر حصے میں مشمولات کو شعرا کے نام یا تخلص کے اعتبار سے درج کیا گیا ہے۔ کتاب کے آخر میں مکمل فہرست شعرا دے دی گئی ہے اور ہر نام کے سامنے وہ صفحات درج کر دیے گئے ہیں جہاں ان کی تخلیقات پیش کی گئی ہیں۔ جن تخلیقات کے مصنف گمنام ہیں انھیں ''لا اعلم'' کہہ کر کلام کی تقطیع میں جگہ دی گئی ہے۔ نظموں کا اول انتخاب جناب خلیق انجم نے نہایت جانفشانی سے کیا تھا۔ میں نے ان کی محنتوں پر کچھ اضافہ کرتے ہوئے مزید تخلیقات شامل کیں اور ان کی فرمائش کے بموجب دیباچہ بھی لکھا۔ یہ کتاب موجودہ شکل میں ظہور پذیر نہ ہوتی اگر قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے جواں سال ڈائرکٹر جناب ڈاکٹر علی جاوید، اردو کونسل کے دیگر کارکنان، بالخصوص ڈاکٹر ابوبکر عباد، ڈاکٹر کلیم اللہ، محترمہ مسرت جہاں اور جناب انتخاب احمد کا بھرپور تعاون مجھے حاصل نہ ہوتا۔ مقامی سطح پر عزیزی سید ارشاد حیدر نے میری امداد کی اور کام کو پورا کرنے کی مہم میں دن کو دن اور رات کو رات نہ سمجھا۔ میں ان سب دوستوں کا شکریہ تہہ دل سے ادا کرتا ہوں۔ مجھے خوشی ہے کہ یہ کتاب 2007 میں منظر عام پر آرہی ہے جب سارا ملک ہماری پہلی جنگ آزادی کی ڈیڑھ سو سالہ یادگار منارہا ہے۔

□□□

ہندوستان کی تحریک آزادی اور اردو شاعری

مصنف: پروفیسر گوپی چند نارنگ

یہ کتاب اس تاریخی سچائی کو مدلل اور پرزور انداز میں سامنے لاتی ہے کہ اردو ہی وہ زبان ہے جس میں استخلاصِ وطن کی لڑائی پورے جوش وخروش کے ساتھ لڑی گئی اور جس کے نغموں اور نعروں نے دلوں کو وہ ولولہ اور دماغوں کو وہ بصیرت عطا کی جس کی قوم کو ضرورت تھی۔

صفحات: 600، قیمت -/300 روپے

مرزا سلامت علی دبیر: حیات اور کارنامے

مصنف: مرزا محمد زماں آزردہ

مرزا سلامت علی دبیر انیسویں صدی کے ان شعرا میں سے ہیں جنھوں نے مرثیہ گوئی کو ایک نئی تب وتاب عطا کی اور ایک منفرد لب و لہجے سے ہم کنار کیا۔ ان پر ابھی تک جو کچھ بھی تحقیقی مواد فراہم ہوسکا ہے وہ بڑی حد تک تشنہ ہے۔ اس کتاب میں دبیر کے حالات زندگی، شعری کارنامے، مراثی کی روایت، کلام دبیر کی اہم خصوصیات، ان کے مطبوعہ اور غیر مطبوعہ کلام کی نشاندہی اور ان کے ادبی مرتبے کے تعین کے ذریعے اس تشنگی کو دور کرنے کی کامیاب کوشش کی گئی ہے۔

صفحات: 592، قیمت -/258 روپے

اردو خبرنامہ

جنگ آزادی میں بہار و بنگال کا حصہ اور اردو زبان وادب

● مونگیر، 3 مئی 2008۔ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی اور رحمانی فاؤنڈیشن مونگیر کے اشتراک سے منعقدہ سہ روزہ سیمینار ''جنگ آزادی میں بہار و بنگال کا حصہ اور اردو زبان و ادب'' کا افتتاح جناب جے پرکاش نارائن یادو، مرکزی وزیر، حکومت ہند نے رحمانی فاؤنڈیشن، مونگیر میں کیا۔ سیمینار کی غرض و غایت پر روشنی ڈالتے ہوئے قومی کونسل کے ڈائرکٹر ڈاکٹر علی جاوید نے کہا کہ ہم رحمانی فاؤنڈیشن کے اشتراک سے اپنی مشترکہ تہذیبی وراثت کو یاد کرنے کے لیے جمع ہوئے ہیں۔ ہم ایک طرف 1857 کا ڈیڑھ سو سالہ جشن منا رہے ہیں تو دوسری طرف بھگت سنگھ اور اردو کے بے مثال شاعر مخدوم محی الدین کی 100 ویں سال گرہ بھی۔ انھوں نے کہا کہ اردو کو ایک منصوبہ بند سازش کے تحت مسلمانوں سے منسوب کیا جا رہا ہے جب کہ 1857 میں اردو نے جو آزادی کی لڑائی لڑی اس میں صرف مسلمان ہی شامل نہیں تھے بلکہ اردو کے بڑے شاعر بہادر شاہ ظفر کی قیادت میں رانی لکشمی بائی، تانتیا ٹوپے اور نانا صاحب نے بھی شانہ بشانہ جنگ لڑی۔ اس سے سو سال پہلے سراج الدولہ کی شہادت پر سب سے پُر اثر شعر راجا رام نارائن موزوں نے کہا جو ہندو تھے:

غزالاں تم تو واقف ہو کہو مجنوں کے مرنے کی
دوانہ مرگیا، آخر کو ویرانے پہ کیا گزری

انھوں نے جناب جے پرکاش نارائن یادو سے درخواست کی کہ اردو کو جس طرح مسلمانوں کی زبان قرار دینے کی کوشش کی جا رہی ہے اس کی سرکاری اور غیر سرکاری سطح پر مذمت کی جانی چاہیے کیونکہ زبانوں کا کوئی مذہب نہیں ہوتا۔

اس کے بعد جناب جے پرکاش نارائن یادو نے اس سیمینار کا افتتاح کیا اور اپنی افتتاحی تقریر میں کہا کہ رحمانی فاؤنڈیشن نے اس اجلاس میں مہمان خصوصی کی حیثیت سے مجھے مدعو کر کے میری عزت افزائی کی ہے۔ انھوں نے کہا کہ رحمانی فاؤنڈیشن کی سیاسی اور علمی خدمات نے پورے ملک میں مونگیر کا ہی نہیں بلکہ پورے صوبے کا نام روشن کیا ہے۔ انھوں نے جنگ آزادی میں اردو اور بہار و بنگال کے رول پر گفتگو کرتے ہوئے بتایا کہ میر قاسم نے مونگیر کو اپنا دارالسلطنت بنایا اور یہاں سے انگریزوں کے خلاف مسلسل جدوجہد کی۔ انھوں نے انگریزی حکومت کو تسلیم نہیں کیا اور آزادی کے لیے اپنی جان کی قربانی دے دی۔ وزیر موصوف نے مونگیر کے ان شہداء کا ذکر کیا جنھوں نے حصولِ آزادی کے لیے اپنی زندگی کے نذرانے پیش کیے۔ انھوں نے کہا کہ ہمیں ان کے کارناموں کو ہمیشہ یاد رکھنا چاہیے۔ انھوں نے یہ بھی کہا کہ اردو ہمیں نفرت نہیں سکھاتی، حب الوطنی سکھاتی ہے۔ اس کا ہندوستان کی جنگ آزادی میں سب سے اہم رول رہا ہے۔ اس کے بعد مولوی منظر رحمانی نے ایک نظم ترنم کے ساتھ سنائی جس میں شہدائے آزادی کو نذرانۂ عقیدت پیش کیا گیا تھا۔ اس کے بعد مولانا ابو طالب رحمانی صاحب نے بڑی پُر اثر تقریر کی اور کہا کہ مولانا ولی رحمانی مبارک باد کے مستحق ہیں کہ انھوں نے ایسے وقت میں اس سیمینار کا انعقاد کیا جب مہاراشٹر اور کئی دوسرے صوبوں میں بہار والوں کی مخالفت کی لہر زوروں پر ہے۔ اس سیمینار سے شاید ان متعصب افراد تک یہ پیغام پہنچے کہ بہار والوں نے اس ملک کی آزادی اور سالمیت کے لیے کیسی کیسی قربانیاں دی ہیں۔ انھوں نے مزید کہا کہ ایک آدمی دنیا کے تمام مذاہب کو قبول تو نہیں کر سکتا لیکن اپنے مذہب پر چلتے ہوئے تمام مذاہب کا احترام ضرور کر سکتا ہے۔ یہ تعلیم میں نے جامعہ رحمانی سے حاصل کی ہے اور یہی اسلام کا پیغام بھی ہے۔ پروفیسر لطف الرحمٰن نے اپنے مخصوص انداز میں جنگ آزادی کی پوری تاریخ پر روشنی ڈالی اور حوالوں کے ساتھ بتایا کہ 1857 کی بغاوت کو پہلی جنگ آزادی کہنا درست نہیں اس سے پہلے بھی کئی جنگیں انگریزوں کے خلاف لڑی گئیں۔ انھوں نے میر قاسم کی انگریزوں کے خلاف جدوجہد کی اہمیت پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ میر قاسم نے انگریزوں کے خلاف جو جنگ لڑی وہ بنگال کے کسی نواب کی انگریزوں کے خلاف آخری جنگ تھی۔ ان سے پہلے بنگال کے کئی نوابوں نے انگریزوں کے خلاف جنگیں کیں۔ انھوں نے اقبال کے اس قول کا حوالہ دیا کہ سراج الدولہ کو ہندوستان نے سمجھا نہیں ورنہ مرشد آباد دوسرا اجمیر ہوتا۔ پروفیسر لطف الرحمٰن نے قومی اردو کونسل کی طرف سے مونگیر میں اس سیمینار کے انعقاد پر کونسل کو مبارکباد دی اور کہا کہ میر قاسم نے یہیں انگریزوں کے خلاف آخری جنگ لڑی۔ انھوں نے مزید کہا کہ انگریزوں کے خلاف ہندوستان میں جتنی تحریکیں چھیڑی گئیں ان کا براہ راست تعلق کہیں نہ کہیں بنگال اور بہار سے ضرور رہا ہے اور اس کی متعدد مثالیں پیش کیں۔ پروفیسر این پی سنگھ نے اپنی تقریر میں ہندوستان کی جنگ آزادی کے پس منظر اور اس میں ہندو مسلم اتحاد کی اہمیت پر روشنی ڈالی اور

بتایا کہ اگر ہندو اور مسلم اتحاد نہ ہوتا تو ہندوستان کی آزادی کا تصور بھی ممکن نہ تھا۔ ان کے بعد مولانا محمد ولی رحمانی نے اپنی صدارتی تقریر میں کہا کہ مجھے یہ احساس ہمیشہ رہا ہے کہ بہار اور بنگال کا جنگ آزادی میں جو حصہ رہا ہے اس کا کماحقہٗ اعتراف نہیں کیا گیا۔ اور اسی احساس کے تحت ہم نے قومی کونسل کے ڈائرکٹر ڈاکٹر علی جاوید سے بات کی اور یہ سیمینار یہاں منعقد کیا گیا۔ انھوں نے مزید کہا کہ قدرتی اتفاقات بھی عجیب ہوتے ہیں اس سیمینار کو اور پہلے ہونا تھا لیکن سیمینار کی تاریخ ٹلتی چلی گئی اور ٹلتے ٹلتے 3 اور 4 مئی تک آپہنچی۔ تاریخ کے طالب علموں کو معلوم ہوگا کہ 4 مئی کی ہی تاریخ تھی جب انگریزوں نے ٹیپو سلطان پر حملہ کیا تھا۔ اور ٹیپو سلطان کی شہادت کے بعد انگریزوں نے اعلان کیا کہ اب ہندوستان ہمارا ہے۔ اس سے اندازہ کیجیے کہ ٹیپو سلطان کی شخصیت کیا تھی۔ آخر میں مولانا بشارت حسین، جنرل سکریٹری، رحمانی فاؤنڈیشن نے مہمانوں کا شکریہ ادا کیا اور 4و5 مئی کے پروگرام کا اعلان کیا۔

● مونگیر، 4 مئی 2008۔ صبح دس بجے قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے سہ روزہ سیمینار ''جنگ آزادی میں بہار و بنگال کا حصہ اور اردو زبان و ادب'' کے دوسرے دن کا پہلا اجلاس ہوا۔ اس اجلاس کی صدارت جناب محمود الرحمٰن، مولانا محمد ولی رحمانی اور پروفیسر لطف الرحمٰن نے کی۔ اس اجلاس میں 6 مقالے پڑھے گئے۔ مولانا انیس چشتی نے ''موپلا ویگن ٹریجڈی: جنگ آزادی کا ایک بھولا بسرا باب''، ڈاکٹر شیریں زباں خانم نے ''ریشمی رومال کی تحریک کا آغاز و انجام''، پروفیسر ایم. ایم. پی. سنگھ نے ''ہندوستانی جنگ آزادی کے بارے میں تاریخی نظریات''، پروفیسر رضوان قیصر نے ''مولانا آزاد کے سیاسی نظریات''، ڈاکٹر پرویز نظیر نے ''برطانوی ظلم و تشدد اور 1857 کی جنگ آزادی'' اور آفتاب احمد آفاقی نے ''تحریک آزادی میں قبائلیوں کا کردار'' کے موضوع پر مقالے پیش کیے جن پر بہت دلچسپ اور علمی بحث و مباحثے ہوئے۔ مباحث کو مولانا محمد ولی رحمانی نے اپنی تقریر میں سمیٹا اور کہا کہ شاہ ولی اللہ نے 1731 کے ایک خط میں لکھا تھا کہ ہندوستان کا مرکزی نظام کمزور ہوگیا ہے اس لیے ہندوستان کو ایک مرکزی شخصیت کی ضرورت ہے۔ انھوں نے مزید کہا کہ ہندوستان کی آزادی کا پورا تصور اگر کسی نے پہلی مرتبہ پیش کیا تو وہ ٹیپو سلطان تھے یا شاہ ولی اللہ۔ اپنی صدارتی تقریر میں ڈاکٹر محمود الرحمٰن نے کہا کہ ٹیپو سلطان کے قومیت کے نظریے سے میں اتنا متاثر رہا ہوں کہ جب بھی میں میسور گیا (غالباً 21-20 مرتبہ) تو سرنگاپٹنم میں ان کی درگاہ پر حاضری ضرور دی۔

دوسرے اجلاس کا آغاز دو بجے دن میں ہوا نظامت ڈاکٹر ابوبکر عباد (پرنسپل پبلی کیشن آفیسر، قومی کونسل) نے کی اور صدارت پروفیسر سلیمان خورشید، جناب ابوذر ہاشمی اور محمد بشارت حسین نے کی۔ اس اجلاس میں جناب عاصم شہنواز شبلی نے ''پلاسی کی جنگ آزادی''، ڈاکٹر مشتاق احمد نے ''بہادر شاہ ظفر کی شخصیت کے چند پہلو''، پروفیسر راجندر پرساد نے ''آندھرا میں جنگ آزادی کی تحریک'' اور پروفیسر شاکر خلیق نے ''مولانا شفیع داؤدی: یادوں کے آئینے میں'' کے عنوانات سے مقالے پیش کیے اور صدور نے تمام پرچوں پر تفصیل سے گفتگو کی۔

● 4 مئی کی شب میں رحمانی فاؤنڈیشن مونگیر کے زیر اہتمام ایک آل انڈیا مشاعرے کا انعقاد بھی کیا گیا جس میں ہندوستان گیر پیمانے پر نامور شعرائے کرام شریک ہوئے۔

اس موقع پر رحمانی فاؤنڈیشن کے چیئرمین مولانا محمد ولی رحمانی نے فرمایا کہ مشاعرہ ادبی و تہذیبی ورثہ ہے اس سے اردو زبان و ادب کا فروغ ہوگا اور نئی نسل کا اردو زبان و ادب سے تعلق مستحکم ہوگا۔ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے ڈائرکٹر ڈاکٹر علی جاوید نے فرمایا کہ رحمانی فاؤنڈیشن اور اس کے چیئرمین حضرت مولانا ولی رحمانی کی توجہ سے اردو زبان و ادب کے فروغ میں بڑی کامیابی مل رہی ہے اس موقع پر بولتے ہوئے پروفیسر لطف الرحمٰن نے کہا کہ ادب چاہے جس زبان کا ہو وہ ہمارا ورثہ ہے۔ باطنی کائنات کی صفائی اسی کے ذریعہ ممکن ہے اگر انسان ادب سے عاری ہو جائے تو وہ محض ایک پڑھا لکھا جانور کے مثل ہوگا۔ مشاعرے کی نظامت مشہور و معروف کہنہ مشق شاعر مخمور سعیدی نے کی اور فرمایا کہ اردو ادب اور شاعری کا خانقاہوں سے گہرا رشتہ رہا ہے، اردو ادب میں خانقاہوں کے فیضان کا دخل ہے۔ اردو زبان میں رچی بسی تہذیب، شرافت، شائستگی اور احترام انسانیت کے عنصر میں خانقاہی روایت کا بڑا دخل ہے۔ خانقاہ رحمانی کی ادب نوازی کے طفیل یہ پروگرام ہو رہے ہیں اور یہ مشاعرہ بھی اسی کا حصہ ہے۔ اس مشاعرے میں شریک شعرا و شاعرات کے اسمائے گرامی حسب ذیل ہیں۔ مخمور سعیدی، پروفیسر لطف الرحمٰن، ڈاکٹر علی جاوید، حبیب ہاشمی، احمد رئیس، نسیم عزیزی، فراغ روہوی، نیر اعظمی، عمران راقم، شگفتہ یاسمین غزل، عاصم شہنواز شبلی، اسمٰعیل نذر، ارشاد آرزو، ابوذر ہاشمی، کوثر پروین، ڈاکٹر مشتاق، امام حسن انور، شیریں زباں خانم، جاوید رحمانی، راشد طراز، مرزا شکوہ بیگ، شاکر خلیق، منظر قاسمی، فیاض رشک اور مظہر مجاہدی۔

● مونگیر، 5 مئی 2008۔ سیمینار کے آخری دن کا پہلا اجلاس صبح دس بجے شروع ہوا۔ صدارت پروفیسر لطف الرحمٰن، جناب انیس چشتی اور جناب بشارت حسین نے کی۔ اجلاس میں بالترتیب دس مقالے پڑھے گئے۔ ''شاہ ولی اللہ کی تحریک'' مولانا عطاء الرحمٰن قاسمی، ''مارکس اور اینگلس اور 1857 کی بغاوت'' ڈاکٹر ارجمند آرا، ''جنگ آزادی میں خانقاہ رحمانی مونگیر کا حصہ'' مولانا محمد امتیاز رحمانی ''پلاسی کی جنگ'' پروفیسر سلیمان خورشید ''میر قاسم کی جنگ''

جناب ابوذر ہاشمی ''پہلی جنگ آزادی میں اردو کا حصہ'' ڈاکٹر شبیر حسن ''جنگ آزادی اور میر قاسم''، شبر امام ''پہلی جنگ آزادی میں علما کا حصہ'' خالد تبسم ایوبی، ''غالب اور 1857'' جاوید رحمانی، ''اردو شاعری اور تحریک آزادی ''فاضل ہاشمی ۔ ان تمام مقالوں پر بڑی علمی اور سنجیدہ بحث ہوئی۔ اپنے صدارتی کلمات میں انیس چشتی نے کہا کہ یہ سمینار بہت کامیاب رہا اور اس اجلاس کے مقالے تمام اجلاس کے مقالوں سے عمدہ تھے۔ پروفیسر لطف الرحمٰن نے اپنی صدارتی تقریر میں کہا کہ 1857 کی جنگ دو تہذیبوں کی جنگ تھی جو صنعتی اور زرعی تمدن کے درمیان لڑی گئی۔ جس میں صنعتی تمدن کی فتح ہوئی اور زرعی تمدن کی شکست۔ انھوں نے مزید کہا کہ شیوا جی بھی ہندو مسلم اتحاد کا اسی طرح علمبردار تھا جس طرح اورنگ زیب تھا مگر ہمارے مورخوں نے ان دونوں کے کردار کو مسخ کیا ہے۔ اس کے بعد اختتامی اجلاس سے خطاب کرتے ہوئے مولانا محمد ولی رحمانی نے 1857 کی جنگ آزادی کے بارے میں موجود مختلف نظریات پر تفصیل سے گفتگو کی اور بتایا کہ 1857 کی جنگ کو پہلی آزادی کی جنگ کہنا درست نہیں اس سے پہلے بھی بہت سے لوگوں نے آزادی وطن کے لیے بڑی بڑی قربانیاں دیں۔ یہ الگ بات ہے کہ ان میں انتظامی صلاحیت کم تھی اور وہ سازشوں کا شکار بھی ہوئے۔ انھوں نے کہا کہ یہ سیمینار بہت ہی کامیاب رہا ہے جس کے لیے میں ڈاکٹر علی جاوید اور پروفیسر لطف الرحمٰن کا مشکور ہوں۔ قومی کونسل کے ڈائرکٹر ڈاکٹر علی جاوید نے اپنی تقریر میں مولانا محمد ولی رحمانی اور خانقاہ رحمانی کے پُر خلوص تعاون کا شکریہ ادا کیا اور ڈاکٹر ابوبکر عباد، پرنسپل پبلی کیشن آفیسر نے تمام مقالہ نگاروں، مقامی منتظمین اور شرکاء کا شکریہ ادا کیا جن کی دلچسپی سے یہ سیمینار کامیاب ہوسکا۔

اردو بہت بڑے تہذیبی تجربے کی دین

● نئی دہلی۔ 26 اپریل، زبان کا تہذیب سے بڑا گہرا رشتہ ہوتا ہے کیونکہ تہذیب کی آغوش میں زبانیں پرورش پاتی ہیں اور زبان کے ذریعے ادب فروغ پاتا ہے، پھر ایک وقت یہ بھی آتا ہے کہ یہ تہذیبیں اور زبانیں تحلیل ہوجاتی ہیں، لیکن جو دنیا کی بڑی زبانیں ہوتی ہیں وہ کچھ ایسے نشانات چھوڑ جاتی ہیں اور ان کے ادب سے ایسے عناصر سامنے آتے ہیں جو ساری دنیا کو روشنی عطا کرتے ہیں۔ ان خیالات کا اظہار دہلی اردو اکادمی کے وائس چیئرمین پروفیسر قمر رئیس نے کیا۔ وہ دہلی سرکار کے محکمہ فن، ثقافت والسنہ اردو سیل کے زیر اہتمام غالب اکادمی میں منعقدہ دو روزہ سیمینار ''زبان، ادب اور تہذیب'' میں اپنا افتتاحی خطبہ پیش کر رہے تھے۔ اس موقع پر اردو آفیسر ڈاکٹر اشفاق عارفی نے سیمینار اور اردو سیل کے مقاصد اور اس کی کامیابیوں پر روشنی ڈالی۔ اس سے قبل اردو سیل کی جانب سے چلائے جارہے اردو کورس میں اردو سیکھنے والوں کو انعامات پیش کیے گئے۔ اردو سرٹیفکیٹ کورس میں اول پوزیشن حاصل کرنے والی منجو بشٹ کو پہلا انعام، منوج کمار کو دوسرا اور تیسرا انعام مشتاق احمد خان کو صدر شعبۂ اردو دہلی یونیورسٹی ڈاکٹر ارتضیٰ کریم کے ہاتھوں پیش کیا گیا۔ ان کے علاوہ معراج الدین اور راجندر کمار یادو کو ایڈوانس اردو کورس اور سفیان احمد اور ہردوار سنگھ کو مضمون نگاری کے لیے انعامات پیش کیے گئے۔ پروفیسر شمیم حنفی نے کلیدی خطبہ پیش کرتے ہوئے کہا کہ تہذیب انسان کو آگے لے جانے کا راستہ ہے اور اس میں مختلف فکر کے لوگ شامل ہوتے ہیں۔ آج تہذیبی تصادم کی بات ہورہی ہے اور یہ فتنہ امریکہ سے اٹھا ہے جبکہ تہذیب میں تصادم کی کوئی گنجائش نہیں ہوتی۔ انھوں نے کہا کہ ادب انسانی زندگی کا گہرائی سے مطالعہ کرتا ہے۔ پریم چند نے جو زندگی اپنے افسانوں اور ناولوں میں پیش کی ہے وہ تاریخ میں نہیں مل سکتی۔ انھوں نے کہا کہ تہذیب کے گہرے تجربات ادب میں ہوتے ہیں۔ اردو خود ایک بہت بڑے تہذیبی تجربے کی دین ہے۔ اردو کا جنم دنیا کی دو بڑی تہذیبوں ہندوستان کی قدیم تہذیب اور اسلامی تہذیب سے ہوا ہے۔ انھوں نے کہا کہ آزادی کے بعد ہندوستان میں اردو کے لیے زمین تنگ کردی گئی اور کچھ لوگوں نے تو اسے غیر ملکی زبان کہا۔ مخمور سعیدی نے اپنا مقالہ پیش کرتے ہوئے کہا کہ زبان کے بغیر ادب کا تصور نہیں کیا جاسکتا۔ انھوں نے کہا کہ زبانیں اور تہذیبیں پیدا ہوتی ہیں، جوان ہوتی ہیں اور بوڑھی ہوکر دم توڑ دیتی ہیں لیکن ادب ہمیشہ زندہ رہتا ہے کیونکہ ادب کی بنیاد معنی پر ہے اور معنی کبھی فنا نہیں ہوتے۔ پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی نے کہا کہ یہ ایک ایسا موضوع ہے کہ اس پر جتنا بولا جائے اتنا کنفیوژن پیدا ہوتا چلا جاتا ہے۔ تہذیب پر بات کرنے والا اپنے کسی مفاد کے تحت تہذیب کو ڈفائن کررہا ہے یہ بھی غور کرنا پڑتا ہے۔ ڈاکٹر خلیق انجم نے کہا کہ تہذیبیں مرتی نہیں ہیں بلکہ ایک تسلسل کے ساتھ آگے بڑھتی اور بدلتی رہتی ہیں۔ دو تہذیبوں یا کئی تہذیبوں کے ملنے سے ایک نئی تہذیب پیدا ہوتی ہے۔ ڈاکٹر علی جاوید نے کہا کہ آج تہذیب کو مذہب سے جوڑ کر دیکھنے کی کوشش کی جارہی ہے۔ یہ ایسی کوشش ہے جس سے انتشار پیدا ہوتا ہے جبکہ تہذیب اتحاد پیدا کرتی ہے۔ پروفیسر اختر الواسع نے کہا کہ تہذیب ایک گلدستے کے مانند ہوتی ہے جس میں ہر طرح کے پھول ہوتے ہیں۔ زبان کا کوئی مذہب نہیں ہوتا لیکن ہر مذہب کو زبان کی ضرورت ہوتی ہے۔ زبان کو سیاست اور بازار کا حربہ بننے سے محفوظ رکھنا چاہیے۔ کمال احمد صدیقی نے بھی اپنے خیالات پیش کیے۔ جامعہ کمیونٹی ریڈیو کے پروڈیوسر شکیل اختر نے اپنا مقالہ پیش کرتے ہوئے کہا کہ اخبارات اپنے عہد کی سچی عکاسی کرتے ہیں۔ دوسرے اجلاس کی صدارت جوگندر پال، پروفیسر صادق اور ڈاکٹر ارتضیٰ کریم نے کی جبکہ پروفیسر علی احمد فاطمی نے زبان،

تہذیب اور ترقی پسند ادب، ڈاکٹر کوثر مظہری نے بکٹ کہانی میں لسانی و تہذیبی نقوش، ڈاکٹر ابوبکر عباد نے اردو ناول کے اہم کردار تہذیبی جہات کے عنوان سے اپنے مقالے پیش کیے۔ سیمینار کی نظامت ڈاکٹر شاہینہ تبسم، شعیب رضا خاں اور شعیب رضا فاطمی نے کی۔ سیمینار میں ہمایوں ظفر زیدی، پروفیسر ابن کنول، انجم عثمانی، اسرار جامعی، متین امروہوی، سلیم امروہوی، ڈاکٹر ارجمند آرا، ڈاکٹر مشتاق صدف، محمد شمیم احمد، راغب الدین کے علاوہ کافی تعداد میں لوگوں نے شرکت کی۔

نئی دہلی۔ 27 اپریل، دنیا کی کوئی ایسی تہذیب نہیں ہے جس کے عناصر دوسری تہذیب میں موجود نہ ہوں لیکن ان عناصر کو مشترکہ تہذیب کہنا درست نہیں ہے۔ یہ مشترک قدریں تو ہوسکتی ہیں تہذیب نہیں۔ ان خیالات کا اظہار ڈاکٹر الطاف احمد اعظمی نے کیا۔ وہ محکمہ فن، ثقافت والسنہ اردو سیل دہلی سرکار کی جانب سے منعقدہ دو روزہ سیمینار کے دوسرے دن کے تیسرے اجلاس میں اپنا صدارتی خطبہ پیش کررہے تھے۔ قبل ازیں اردو سیکھنے والوں کو انعامات سے نوازا گیا۔ اس اجلاس میں پروفیسر شریف حسین قاسمی نے امیر خسرو: ہماری تہذیب کا ایک نمائندہ شاعر، زبیر رضوی نے فنون لطیفہ پر تہذیبی اثرات، ڈاکٹر خسرو متین نے قومی یگانگت اور ہندوستانی موسیقی، ڈاکٹر شافع قدوائی نے معلومات پر مبنی سماج کا تصور اور زبان و ادب، ڈاکٹر جمیل اختر نے قرۃ العین حیدر کے افسانوں میں ہندوستانی فکر و تہذیب کی ڈاکٹر احمد کفیل نے اردو مرثیہ ایک تہذیبی سنگم کے عنوان سے مقالے پیش کیے۔ اس اجلاس کی مجلس صدارت میں ڈاکٹر شاہد پرویز اور پروفیسر ابن کنول تھے۔ اجلاس کی نظامت ڈاکٹر مشتاق صدف نے کی۔ پروفیسر شمس الحق عثمانی نے کہا کہ کیا تہذیب صرف مظاہر تک محدود ہے؟ تہذیب دراصل مختلف انسانی فکر کو ایک ساتھ پیش کرنے کا نام ہے۔ آج مشرقی تہذیب کو مسمار کرنے کی سازشیں کی جارہی ہیں۔ انھوں نے کہا کہ ہمیں اپنے رویے کو تبدیل کرنا چاہیے۔ شریف الحسن نقوی نے اپنی مختصر تقریر میں صرف اتنا اشارہ کیا کہ روشن خیالی کا مطلب اپنی بہن بیٹیوں کو غیر مذہب کے ہاتھوں میں سونپ دینا نہیں ہے۔ شریف حسین قاسمی نے کہا کہ ہم نے کبھی یہاں بیٹھ کر مذہب یا تہذیب پر مناظرے نہیں کیے ہیں بلکہ یہاں کی چیزوں کو سمجھنے کی کوشش کی ہے اور اسی ضرورت کے تحت یہاں کی کتابوں کے تراجم بھی ہم نے کیے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ امیر خسرو نے ہندوستان کی تمدنی روایات کا تعارف پیش کیا ہے۔ زبیر رضوی نے کہا کہ تہذیبی تصادم کوئی نئی چیز نہیں ہے دراوڑی اور آریائی تہذیب میں تصادم تھا۔ زبیر رضوی نے سندھ اور بابل و نینوا کی تہذیب کے حوالے پیش کیے۔ سیمینار کے آخر میں ڈاکٹر اشفاق احمد عارفی نے محکمے کی جانب سے شریک سیمینار تمام مہمانوں کا شکریہ ادا کیا۔ (ہمارا سماج، دہلی)

سہ روزہ ادبی اجتماع ''نئے پرانے چراغ''

● نئی دہلی۔ 3 مئی، اردو اسی لیے زندہ ہے کہ وہ عوام کی زبان ہے اور عوام کے قریب ہے۔ اردو کی سیکولر اقدار کو اور زیادہ مضبوط کرنے کی ضرورت ہے۔ اس کے علاوہ تحقیق کے گرتے ہوئے معیار کو بھی بلند کرنا ہوگا اور قارئین اور تخلیق کاروں کے درمیان پل قائم کرنا ہوگا۔ ان خیالات کا اظہار آج اردو اکادمی دہلی کے زیر اہتمام غالب اکادمی حضرت نظام الدین میں سہ روزہ ادبی اجتماع ''نئے پرانے چراغ'' کے افتتاحی اجلاس میں صدارتی خطبہ پیش کرتے ہوئے جامعہ ملیہ اسلامیہ کے سابق رجسٹرار خواجہ محمد شاہد نے کیا۔ اجلاس کی نظامت انیس اعظمی نے کی جبکہ سید مرغوب حیدر عابدی نے اظہار تشکر کیا۔ خواجہ محمد شاہد نے کہا کہ اس سہ روزہ سیمینار میں پہلی بار پیروڈی جیسے اہم موضوع کو جگہ دی گئی ہے، یہ ایک اچھا قدم ہے۔ انھوں نے کہا کہ اردو میں تحقیق کا معیار گرتا جارہا ہے اس پر غور کرنے کی ضرورت ہے۔ انھوں نے اردو کی سیکولر روایات اور اقدار کو اور مضبوط بنانے کی ضرورت پر زور دیا۔ مہمان اعزازی پروفیسر اختر الواسع نے کہا کہ اردو اکادمی کا یہ سیمینار ''نئے پرانے چراغ'' بہت اہم ہے کیونکہ چراغ سے ہمیشہ نیا چراغ جلتا ہے۔ سیمینار میں پیروڈی کو شامل کیے جانے کے فیصلے کا انھوں نے خیر مقدم کیا اور کہا کہ زندہ قوموں اور زندہ معاشروں کی ایک پہچان یہ بھی ہوتی ہے کہ وہ ہنستے بھی ہیں اور اپنے اوپر دوسروں کو ہنسنے کا موقع بھی دیتے ہیں اور یہ کام اردو والے ہمیشہ سے کرتے آئے ہیں۔ ڈاکٹر کمال احمد صدیقی نے اپنی مختصر تقریر میں پیروڈی کے فن اور تاریخ پر روشنی ڈالی انھوں نے کہا کہ پیروڈی میں طنز نہیں ہوتا بلکہ اس کا مقصد صرف تفریح ہوتا ہے۔ خیر مقدمی کلمات پیش کرتے ہوئے اکادمی کے وائس چیئرمین پروفیسر قمر رئیس نے بتایا کہ ''نئے پرانے چراغ'' کے فارمیٹ میں تبدیلی کی گئی ہے۔ پہلی مرتبہ اس پروگرام میں پیروڈی کو شامل کیا گیا اور شعرا کو طرحی مصرعے دیے گئے ہیں۔ انھوں نے اکادمی کی دیگر کارکردگی پر بھی روشنی ڈالی۔

بعد ازاں ''نئے پرانے چراغ'' کے پیروڈی اجلاس کی صدارت کمال احمد صدیقی، پروفیسر مظفر حنفی اور اظہار اثر نے کی جبکہ نظامت کے فرائض شکیل حسن شمسی نے انجام دیے۔ اس موقع پر پروفیسر ظفر احمد نظامی، منظور عثمانی، سید ضمیر حسن دہلوی، محمود نقوی، اقبال انصاری، ڈاکٹر شعیب رضا خاں وارثی اور سعید اختر اعظمی نے نثری پیروڈیاں پیش کیں۔ جبکہ پروفیسر مظفر حنفی، اظہار اثر، ڈاکٹر کمال احمد صدیقی، رفعت سروش، پروفیسر قمر رئیس، پروفیسر خالد محمود، علی مہدی دہشت، فاروق ارگلی، متین امروہوی، شکیل حسن شمسی، اقبال فردوسی،

تحسین منور اور اسرار جامعی وغیرہ نے منظوم پیروڈیاں سنائیں۔

اجلاس کے آخر میں صدارتی کلمات کے تحت ڈاکٹر کمال احمد صدیقی نے پیروڈی پر مبنی اس اجلاس کے تجربے کو کامیاب قرار دیا اور کہا کہ اس میں بہتر چیزیں پیش کی گئیں۔ بعد ازاں نصرت گوالیاری کی صدارت اور اعجاز انصاری کی نظامت میں طرحی مشاعرے کا انعقاد کیا گیا۔

● نئی دہلی۔ 4 مئی، سہ روزہ ادبی اجتماع ''نئے پرانے چراغ'' کے دوسرے دن تنقیدی و تحقیقی اجلاس میں مغرب سے مستعار تنقیدی نظریوں کی نکتہ چینی کی گئی اور اس بات کی ضرورت پر زور دیا گیا کہ تخلیق کاروں کو ان کی تخلیقات کے آئینے میں پرکھا جانا چاہیے۔ اس جلسے کی مجلس صدارت میں پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی، ڈاکٹر شریف احمد اور پروفیسر شمس الحق عثمانی شامل تھے۔ اپنی صدارتی تقریر میں صدیق الرحمٰن قدوائی نے کہا کہ بڑا فن کار تمام پیمانوں کو توڑ کر آگے بڑھ جاتا ہے، وہ دوسروں سے مختلف لکھتا ہے چنانچہ اس کا محاسبہ بھی بندھے ٹکے اصولوں سے بالاتر ہوکر کیا جانا چاہیے۔ ڈاکٹر شریف احمد نے مروجہ تنقیدی رویوں پر اپنے ردعمل کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ اگر مغرب سے تنقید کی کتابیں آنی بند ہو جائیں تو بہت سے ناقدین کی دکانیں بند ہو جائیں گی۔ انھوں نے کہا کہ ہمارے یہاں بہت سے ایسے تخلیق کار ہیں جن کی نگارشات کے تجزیے کا حق ادا نہیں ہوسکا۔ پروفیسر شمس الحق عثمانی نے کہا کہ آج کا تخلیق کار تمام تنقیدی عمل اصطلاحات سے آزاد ہو چکا ہے یہ چند افراد کی اپنی بقا کا مسئلہ ہے کہ وہ کس تھیوری، یا کس زندان فکر کے قیدی بنے ہوئے ہیں۔ انھوں نے بعض قلم کاروں کی از سر نو تعیین قدر کی ضرورت پر زور دیتے ہوئے کہا کہ تنقیدی عصبیت سے آزاد ہوکر تخلیقی فن پاروں پر توجہ دینی چاہیے۔ انھوں نے کہا کہ یونیورسٹیوں میں ایم فل اور پی ایچ ڈی کے لیے اختیار کیا جانے والے رویوں پر بھی نظر ثانی کی جانی چاہیے۔ انھوں نے پی ایچ ڈی کرتے ہی استاد بن جانے اور استاد بنتے ہی نقاد ہونے کا دعویٰ کیے جانے کے رجحان کو تشویشناک بتایا۔ اس اجلاس میں ڈاکٹر ابرار رحمانی (جدیدیت سے مابعد جدیدیت تک)، ڈاکٹر ابوظہیر ربانی (اردو میں تانیثیت، رجحان یا تحریک)، عمیر منظر (اردو نظم آزادی سے 1980 تک)، ممتاز عالم (اردو ناولوں میں عصری مسائل 1940 کے بعد)، نوشاد عالم (فرحت اللہ بیگ کی تصانیف میں دہلی تہذیب کی عکاسی) اور تنویر احمد (جدید تنقید کے معمار احتشام حسین) نے اپنے مقالات پیش کیے۔ نظامت ڈاکٹر نجیب اختر نے کی۔ دوپہر کے بعد منعقد تخلیقی اجلاس کی صدارت کرتے ہوئے معروف فکشن نگار جوگیندر پال نے کہا کہ خاموشی سے اپنی بات کہہ جانے کا نام فن کار شور بہت مچاتے ہیں جس کے نتیجے میں ایسی کہانیاں وجود میں نہیں آتیں جنھیں پڑھ کر قاری کو یہ محسوس ہو کہ یہ کہانی خود اس نے لکھی ہے۔ اچھی کہانی وہ ہوتی ہے جو اپنے قاری کو اپنے معنی خود تلاش کرنے کا موقع دیتی ہے۔ مجلس صدارت میں شامل پروفیسر قدوس جاوید نے کہا کہ آج کی کہانی آج کی شاعری کی طرح انسان کے جینے کے جھوٹے سچے اور کچے پکے عمل کا تمام تر خوبیوں اور خامیوں کے ساتھ بیان کررہی ہے۔ پروفیسر ارتضیٰ کریم نے پیش کی گئی کہانیوں پر مجموعی تاثر پیش کرتے ہوئے کہا کہ پڑھی گئی تمام کہانیاں خوش آئند مستقبل کی غماز ہیں۔ انھوں نے افسانوی نشستیں تواتر کے ساتھ منعقد کیے جانے کی ضرورت کا اظہار کیا۔ مجلس صدارت میں ڈاکٹر جمیل اختر بھی شامل تھے۔ نظامت ڈاکٹر زاہد الحق نے کی۔ جن قلم کاروں نے افسانے پیش کیے ان میں انجم عثمانی، اقبال مہدی، ترنم ریاض، ذکیہ ظفر، جی آر سید، پرویز شہریار اور وسیم راشد کے نام شامل ہیں۔ شام کو طرحی نشست آراستہ کی گئی جس کی صدارت فصیح اکمل اور نظامت معین شاداب نے کی۔

● نئی دہلی۔ 5 مئی، اردو اکادمی دہلی کے زیر اہتمام غالب اکادمی حضرت نظام الدین میں جاری 14 واں سہ روزہ ادبی اجتماع ''نئے پرانے چراغ'' آج اپنے اختتام کو پہنچا۔ اس ادبی اجتماع میں اس بار تقریباً 200 فنکاروں نے شرکت کی اس سہ روزہ سیمینار میں پہلی بار پیروڈی کو جگہ دی گئی تھی وہیں تینوں دن منعقد ہونے والی محفل مشاعرہ کے لیے شعرا کو چار مصرعے دیے گئے تھے۔ اردو اکادمی نے جس مقصد سے اس کے فارمیٹ میں تبدیلی کی تھی وہ اس میں کامیاب رہی۔ آج آخری دن کے پہلے تنقیدی اور تحقیقی اجلاس کی صدارت قاضی عبید الرحمٰن ہاشمی، پروفیسر محمد شاہد حسین اور سید مرغوب حیدر عابدی نے کی جبکہ نظامت کے فرائض ڈاکٹر شاہد تسلیم نے ادا کیے۔ اس اجلاس میں ڈاکٹر ظل ہما نے ''اردو افسانے میں نئے سماجی سروکار''، ڈاکٹر نفیس حسن نے ''دہلی میں اردو تعلیم کے مسائل''، شعیب رضا فاطمی نے ''کیا اردو شاعری تعطل اور انحطاط کا شکار ہے؟''، عفیفہ بیگم نے ''اردو ناول پر مشترکہ تہذیب کے اثرات: آزادی کے بعد''، خالد انجم عثمانی نے ''انیسویں صدی میں دہلی کے نثری اسالیب''، عباد احمد نے ''ہندی کے اہم ناولوں پر تقسیم ہند کے اثرات'' اور محمد شمیم احمد نے ''ممتاز حسین کی تنقید نگاری'' کے عنوانات پر مقالے پیش کیے۔ صدارتی کلمات میں پروفیسر قاضی عبید الرحمٰن ہاشمی نے زبان وادب کی خدمت کرنے والوں کی کاوشوں کی ستائش کرتے ہوئے کہا کہ اردو کا مستقبل ہماری کوششوں سے بہتر ہوگا چنانچہ ہمیں احساس محرومی کا شکار نہ ہوکر اپنی کوششیں جاری رکھنی چاہئیں۔ پروفیسر شاہد حسین نے اپنی صدارتی تقریر میں ''نئے پرانے چراغ'' میں ریسرچ اسکالروں کی شمولیت کو بحال کرنے کے اکادمی کے قدم کی ستائش کی۔ انھوں نے تجویز پیش کی کہ پروگرام میں ریسرچ

اسکالروں کے مسائل پر بھی گفتگو ہونی چاہیے۔ سید مرغوب حیدر عابدی نے اجلاس کے حوالے سے اپنا مجموعی تاثر پیش کیا۔ تخلیقی نثر پر مشتمل دوسرے اجلاس کی مجلس صدارت میں شامل معروف افسانہ نگار رتن سنگھ نے اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ افسانہ نگاروں کو ایسی کہانیاں لکھنی چاہئیں جو نہ صرف اردو بلکہ ہندوستان کی نمائندہ کہانی کہلائیں۔ مجلس صدارت کے دوسرے رکن سید محمد اشرف نے اس اجلاس میں پڑھی گئی کہانیوں کا تجزیہ کیا۔ انھوں نے ایک شعر کے حوالے سے کہا کہ اچھی کہانی لکھنے کے لیے دل کو لہو کرنا پڑتا ہے۔ معروف ادیبہ پروفیسر" صغریٰ مہدی نے کہا کہ کہانی کار کی ذمے داری صرف کہانی لکھنا ہے۔ قارئین کے سوالوں کے جواب دینا نہیں۔ انھوں نے کہا کہ قارئین افسانہ پڑھ کر اپنی رائے اور تاثرات کا اظہار کریں، تنقید کریں لیکن تخلیق کار سے سوال نہ کریں۔ اس اجلاس میں بلقیس ظہیر الحسن، مشرف عالم ذوقی، نگار عظیم، اظہار عثمانی، خورشید اکرم اور طاہرہ منظر نے اپنے اپنے افسانے پڑھے جبکہ نصرت ظہیر نے انشائیہ ''سیمینار میں ہاتھی'' پیش کیا۔ اجلاس کی نظامت ڈاکٹر ندیم احمد نے کی۔ آخر میں اکادمی کے وائس چیئرمین پروفیسر قمر رئیس نے اظہار تشکر کرتے ہوئے اس بات پر زور دیا کہ افسانوی محفلوں میں افسانہ نگار اور سامعین کے درمیان رابطہ ہونا چاہیے تاکہ موضوع، مواد، فن اور تکنیک کو سمجھتے ہوئے قارئین کہانی میں شامل ہوسکیں اور اس سے پوری طرح محظوظ ہوسکیں۔ (راشٹریہ سہارا، نئی دہلی)

اردو کا مقدمہ ہائی کورٹ میں

● نئی دہلی۔ 6 مئی، حکومت کے اردو کی جانب سے بے توجہی برتنے اور اس کے ساتھ سوتیلے برتاؤ پر اردو حلقوں میں جو بے چینی ہے اس کی طرف سے نہ حکومت بے خبر ہے اور نہ ہی حکومت دہلی کے اعلیٰ افسران۔ فروغ اردو سوسائٹی اور شکشا سیوا سمیتی کے صدر ڈاکٹر زین العابدین نے دہلی ہائی کورٹ میں ایک پٹیشن دائر کی ہے جس میں سپریم کورٹ آف انڈیا کے سینئر وکیل مشتاق احمد پیروی کے لیے نامزد کیے گئے ہیں۔ واضح ہو کہ اردو میڈیم اسکولوں میں چاہیے وہ دلی میونسپل کارپوریشن کے تحت چل رہے ہوں یا نئی دہلی میونسپل کمیٹی کے زیر اہتمام، اردو زبان کی تعلیم پر حکومت کی کوئی توجہ نہیں ہے۔

اردو نصاب کے وقت پر فراہم نہ ہونے کے علاوہ تمام اردو میڈیم اسکولوں میں اساتذہ کی قلت اور پندرہ سال سے نئی تقرریوں پر پابندی نیز ریٹائر ہونے والے اردو اساتذہ کی جگہ نئے لوگوں کا تقرر نہ کیا جانا بھی شامل ہے جبکہ اردو میڈیم اسکولوں میں غیر اردو داں پرنسپل ہونا عجیب بات ہے۔ ایک افسوسناک پہلو یہ بھی ہے کہ دہلی کے 22 اردو میڈیم اسکولوں میں 13 سال سے نئے اساتذہ کی تقرری نہیں ہوئی جبکہ اس درمیان کتنے ہی لوگ ریٹائر ہوئے اور کتنے اللہ کو پیارے ہوگئے۔ اس کے علاوہ اردو میڈیم اسکولوں کے بچے 5ویں کلاس پاس کرنے کے بعد چھٹی کلاس میں اردو اسکولوں کی کمی کی وجہ سے ہندی یا سنسکرت میڈیم میں داخلہ لینے پر مجبور ہیں۔ ان تمام باتوں کو ذہن میں رکھتے ہوئے ڈاکٹر زین العابدین پرنسپل ہاشم الدین اور شعور احمد نے مل کر عوامی جدوجہد کے تحت ہائی کورٹ میں جانے کا فیصلہ کیا۔ اگر اردو داں حلقہ اس طرح کی جدوجہد جاری رکھے تو ایک روز اردو کا حق ملنا ناگزیر ہے۔

(راشٹریہ سہارا، نئی دہلی)

اردو یونیورسٹی کا برطانوی یونیورسٹیوں کے ساتھ اشتراک

● ایسوسی ایشن آف کامن ویلتھ یونیورسٹیز، لندن کے سکریٹری جنرل پروفیسر جان ٹیرینٹ نے مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کو دعوت دی ہے کہ وہ برطانیہ کی یونیورسٹیوں کے ساتھ اشتراک کرتے ہوئے وہاں اپنے مراکز قائم کرے۔ اس طرح اردو یونیورسٹی برطانیہ میں مقیم ایسے افراد کو فائدہ پہنچا سکتی ہے جو اردو میڈیم سے اپنی تعلیم کا احیا کرنا چاہتے ہیں۔ اردو یونیورسٹی برطانوی یونیورسٹیوں کے ساتھ مل کر غیر انگریزی داں طبقے کی تعلیمی سہولت کے دیگر امکانات کی بھی تلاش کرسکتی ہے۔ پروفیسر جان ٹیرینٹ نے ان خیاالات کا اظہار آج یہاں مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی میں ایک لکچر کے دوران کیا۔ وہ یہاں ایسوسی ایشن آف کامن ویلتھ یونیورسٹیز کی ماہ نومبر میں مجوزہ ایگزیکٹیو ہیڈ کانفرنس کی تیاری کے سلسلے میں آئے ہوئے ہیں۔ دنیا کے مختلف خطوں سے تعلق رکھنے والی پانچ سو سے زائد یونیورسٹیاں اس سو سالہ قدیم ایسوسی ایشن کی رکن ہیں اور توقع ہے کہ کانفرنس میں تین سو سے زائد مندوبین شرکت کریں گے۔ کانفرنس کی میزبانی مولانا آزاد یونیورسٹی اور حیدرآباد سنٹرل یونیورسٹی مشترکہ طور پر کررہی ہیں۔ آج منعقدہ لکچر تقریب کی صدارت وائس چانسلر پروفیسر اے ایم پٹھان نے کی جبکہ پرو وائس چانسلر پروفیسر کے آر اقبال احمد نے معزز مہمان کا خیر مقدم کیا۔

پروفیسر ٹیرینٹ نے اپنے لکچر میں اس بات پر زور دیا کہ اعلیٰ تعلیم ہر ملک کے لیے اولین ترجیح ہونی چاہیے اور اسی کے ساتھ اعلیٰ تعلیم تک ہر طبقے کی رسائی کو یقینی بنانا چاہیے۔ انھوں نے کہا کہ آج عالمیت کے دور میں زبان اور نصاب کی یکسانیت کا مسئلہ درپیش ہے، یونیورسٹیوں کی بڑھتی ہوئی تعداد کی وجہ سے انسانی وسائل کی کمی کا سامنا ہے، عالمی سطح پر موجود اطلاعات تک طلبہ کی رسائی میں اساتذہ کا رول زیر غور ہے اور انگریزی کے علاوہ دیگر زبانوں کے بولنے والوں کے مسائل اور ضرورتیں جدا جدا ہیں، ان بھی امور پر مجوزہ کانفرنس میں غور کیا جائے گا اس لیے کہ تعلیمی دنیا کے یہی سلگتے ہوئے موضوعات ہیں۔ پروفیسر ٹیرینٹ نے عربی کے لکچرر ڈاکٹر جاوید ندیم کے اسکالرشپ اور فیلوشپ

کے تعلق سے ایک سوال کے جواب میں بتایا کہ ایسوسی ایشن کوئی سرکاری ادارہ نہیں جس کا اپنا فنڈ ہو البتہ برطانوی حکومت اور ممبر یونیورسٹیوں کی مدد سے مختلف تحقیقی وسفری وظائف کا اہتمام کیا جاتا ہے۔ شعبۂ صحافت کے لکچرر جناب شہباز نے سوال اٹھایا کہ یہاں کے اردو میڈیم کے طلبہ و اساتذہ کو اگر انگریزی زبان میں دقت ہوتی ہے تو وہ بھلا وہاں کے وظائف سے کیسے استفادہ کر سکتے ہیں۔ اس سوال پر پروفیسر ٹیرینٹ نے تشویش ظاہر کرتے ہوئے کہا کہ آج انگریزی کے بغیر کوئی چارہ نہیں ہے۔ صرف ہندوستان ہی نہیں دنیا کے بے شمار ممالک کے اسکالر اپنے مضامین میں پختہ ہونے کے باوجود زبان کی وجہ سے کئی مواقع سے استفادہ نہیں کر پاتے ہیں۔ تاہم انھوں نے ڈاکٹر شاہدہ کے ایک سوال کے جواب میں کہا کہ ہندوستان، پاکستان اور بنگلہ دیش کی نئی نسل بہترین انگریزی جانتی ہے اور ادھر کے طلبہ وہاں کے طلبہ سے کسی بھی طرح کم نہیں ہیں۔ پروفیسر آمنہ کشور نے یکساں نصاب اور یکساں اکیڈمک کلینڈر کی بندش کے تعلق سے سوال کیا جس کے جواب میں مہمان اسکالر نے لچکدار رویہ اختیار کرنے کی طرفداری کی البتہ انھوں نے مکمل آزادی سے بھی انکار کیا۔ انھوں نے کہا علاقے، وقت، طلبہ اور اساتذہ کی مانگ کے مطابق اکیڈمک معاملات طے ہونے چاہئیں۔ (ڈاک سے)

اردو ناول ''کل اور آج''

● وارانسی۔ 28 مارچ، شعبۂ اردو بنارس ہندو یونیورسٹی کے زیر اہتمام اترپردیش اردو اکادمی، لکھنؤ کے مالی تعاون سے ''اردو ناول'' کل اور آج'' کے موضوع پر دو روزہ قومی سیمینار کا (27، 28 مارچ) انعقاد کیا گیا۔ جس میں خاصی تعداد میں ادیبوں اور قلمکاروں نے شرکت کی۔ سیمینار کا افتتاح پروفیسر ایس۔ پی۔ اوجھا، وائس چانسلر، چودھری چرن سنگھ یونیورسٹی، میرٹھ اور صدارت پروفیسر ایس۔ این۔ پانڈے، ڈین، فیکلٹی آف آرٹس نے کی۔ اپنے استقبالیہ کلمات میں صدر شعبۂ اردو پروفیسر نسیم احمد نے مہمانوں کا خیرمقدم کرتے ہوئے شعبۂ اردو کی اب تک کی علمی و ادبی کارکردگی اور مستقبل میں شعبے کے ادبی پروگراموں پر تفصیل سے روشنی ڈالی۔ اپنی افتتاحی تقریر میں پروفیسر ایس۔ پی۔ اوجھا نے اردو کو مشترکہ قومی تہذیب کی علامت قرار دیتے ہوئے فرمایا کہ اردو زبان صحیح معنوں میں دلوں کی زبان ہے۔ یہ دلوں کو جوڑنے والی بھاشا ہے۔ اس میں ہماری مٹی کی خوشبو رچی بسی ہے۔ اردو کے ممتاز فکشن نگار پروفیسر حسین الحق نے اپنے کلیدی خطبے میں اردو ناول کے ارتقائی سفر کا جائزہ لیتے ہوئے معاصر ناولوں کے اختصاصی پہلوؤں پر تفصیلی روشنی ڈالی اور کہا کہ ''اردو ناول ابتدا سے موجودہ عہد تک سماجی، سیاسی، معاشی اور معاشرتی زندگی کو پیش کرنے کا خوبصورت وسیلہ رہا ہے۔ اس نے سماجی سروکار سے ہمیشہ وابستگی رکھی ہے۔'' اس افتتاحی اجلاس کی نظامت ڈاکٹر آفتاب احمد آفاقی نے اور اظہار تشکر کی رسم ڈاکٹر عبدالسلیم نے ادا کی۔

پہلے اجلاس کی صدارت پروفیسر سلیمان اطہر جاوید، پروفیسر حسین الحق اور پروفیسر شباب الدین نے کی۔ اس اجلاس میں ڈاکٹر مشرف علی نے'' جیلانی بانو کا ناول'' بارش سنگ' ایک تجزیاتی مطالعہ'' اور ڈاکٹر محمد کاظم نے'' دو یہ دانی، ایک جائزہ'' کے عنوان سے اپنے مقالے پیش کیے۔ اس اجلاس کی نظامت بھی ڈاکٹر آفتاب احمد آفاقی نے اور اظہار تشکر کی رسم ڈاکٹر عبدالسلیم نے ادا کی۔

دوپہر کے وقفے کے بعد دوسرا اجلاس شروع ہوا جس کی نظامت ڈاکٹر یعقوب یاور نے کی۔ اس اجلاس میں پروفیسر رفعت جمال نے ''تقسیم ہند کا کرب اور عینی آپا کا درد''، پروفیسر شباب الدین نے'' اردو ناول کے سفر میں توبۃ النصوح کی معنویت'' ڈاکٹر حبیب اللہ نے'' کار جہاں دراز ہے: ایک مطالعہ'' وسیم حیدر ہاشمی نے'' سجاد ظہیر کا ایک کردار۔ نعیم الدین'' ڈاکٹر مشتاق احمد نے'' نئے امکانات کا ناول نگار: آچاریہ شوکت خلیل'' ڈاکٹر اسلم جمشید پوری نے'' بہت دیر کردی کی معنویت'' پروفیسر سلیمان اطہر جاوید نے'' عزیز احمد کی ناول نگاری'' اور ڈاکٹر شاہینہ رضوی نے'' نذیر احمد کے ناولوں کے نسوانی کرداروں پر ایک نظر'' کے عنوان سے اپنے مقالے پیش کیے۔ اس اجلاس کی صدارت پروفیسر سید حنیف احمد نقوی اور ڈاکٹر منظر حسین نے کی۔ نظامت کے فرائض پروفیسر نسیم احمد نے انجام دیے۔

28 مارچ کے صبح گیارہ بجے سے شروع ہونے والے تیسرے اجلاس کی صدارت پروفیسر شاہد حسین، پروفیسر رفعت جمال اور پروفیسر علی احمد فاطمی نے کی۔ اس اجلاس میں شعبۂ اردو کے کئی ریسرچ اسکالرز نے مقالے پیش کیے۔ ان میں شبنم خاتون نے'' نذیر احمد کے ناولوں میں نسوانی کردار''، رقیہ خاتون'' نے'' حالی ایک قصہ گو کی حیثیت سے''، ناہید فاطمہ نے'' بستی ایک تنقیدی جائزہ''، شبانہ خاتون نے'' نذیر احمد کا ناول توبۃ النصوح''، عظمیٰ پروین نے'' نذیر احمد کی شخصیت کے چند پہلو'' اور امرتا کماری نے'' اردو ناول میں عورت کا تصور'' کے عنوان سے اپنے مقالے پیش کیے۔ دوسرے مقالہ نگاروں میں ڈاکٹر حسین احمد نے'' بولومت، چپ رہو'' ڈاکٹر رضی الرحمٰن نے ہمعصر اردو ناول منظر اور پس منظر فائر ایریا کے حوالے سے''، ارشاد عالم نے'' اردو ناول اور انٹرنیٹ'' پروفیسر علی احمد فاطمی نے'' اردو ناول: کل اور آج'' ڈاکٹر ارتضیٰ کریم نے'' اردو ناولوں کے ناقدین کے رویے'' اور ڈاکٹر رفیع اللہ نے'' دو یہ بانی: ایک جائزہ'' کے عنوان سے مقالے پڑھے۔

اختتامی اجلاس کی صدارت پروفیسر سلیمان اطہر جاوید، پروفیسر نسیم احمد،

ڈاکٹر شاہینہ رضوی اور ڈاکٹر عبدالسلیم نے کی جبکہ نظامت کے فرائض ڈاکٹر آفتاب احمد آفاقی نے انجام دیے۔ اس سیمینار میں کثیر تعداد میں اردو ادبا، شعرا کے علاوہ ریسرچ اسکالرز نے شرکت کی۔ (ڈاک سے)

''ترقی پسند تحریک اور ممبئی''

● ممبئی۔ ''ترقی پسند تحریک اور ممبئی'' کے موضوع پر سیمینار کر کے شہر ممبئی کو یاد دلایا گیا ہے کہ اس کا ناتہ ترقی پسند تحریک کے قلمکاروں سے کتنا گہرا اور کتنا پرانا ہے۔ اس شہر کے ادیبوں اور شاعروں نے ترقی پسند تحریک کو آگے بڑھانے میں جو کارہائے نمایاں انجام دیے ہیں وہ ادب کی تاریخ کا ایک روشن باب ہے جس پر مزید کام کرنے کی ضرورت ہے۔ یہ خیال غلط ہے کہ ترقی پسند تحریک محض ایک پروپیگنڈہ تھی' ان خیالات کا اظہار فلمی اداکارہ محترمہ شبانہ اعظمی نے شعبۂ اردو ممبئی یونیورسٹی کے زیر اہتمام دو روزہ قومی سیمینار کے افتتاحی اجلاس میں کیا۔ جو 27 اور 28 مارچ 2008 کو کالینا کیمپس میں منعقد ہوا۔ سیمینار میں مہمان اعزازی کی حیثیت سے سابق وزیر اور موجودہ ایم. ایل. اے نواب ملک بھی موجود تھے۔

انجمن اسلام ممبئی کے صدر جناب سمیع خطیب نے اپنے صدارتی خطبے میں ممبئی سے وابستہ ترقی پسند تحریک کے شاعروں اور ادیبوں کی سرگرمیوں کو اجاگر کیا اور ان کے حوالے سے اپنی باتیں اور یادیں تازہ کیں۔ اس کے علاوہ ساحر لدھیانوی کی نظم بنگال اور تاج محل کے حوالے سے گفتگو کی۔ ترقی پسند ادیب جناب عنایت اختر نے اپنے افتتاحی خطبے میں ممبئی کے حوالے سے ترقی پسند تحریک پر روشنی ڈالی۔ پھر ممبئی کے ترقی پسند شعرا اور ادبا سے اپنے ذاتی تعلقات کو جذباتی انداز میں پیش کیا۔ پروفیسر عبدالستار دلوی نے کلیدی خطبے میں ترقی پسند تحریک کی اہمیت بیان کی اور آخر میں اس بات پر زور دیا کہ ترقی پسند تحریک کی طرح آج ہمیں اردو تحریک شروع کرنے کی ضرورت ہے۔ تاکہ اردو زبان کو درپیش مسائل حل ہو سکیں اور صحیح معنوں میں اردو کا رشتہ عوام سے جوڑا جا سکے۔

افتتاحی اجلاس کی ابتدا میں شعبۂ اردو، ممبئی یونیورسٹی کے صدر ڈاکٹر صاحب علی نے مہمانوں کا استقبال کرتے ہوئے ان کا مختصراً تعارف پیش کیا۔ پھر سیمینار کی غرض و غایت پر روشنی ڈالی۔ اس کے بعد مختصر طور پر ممبئی کے ترقی پسند قلمکاروں کی خدمات کو بھی اجاگر کیا۔

اس دو روزہ قومی سیمینار کے پانچ اجلاس میں کل 20 مقالے پڑھے گئے۔ پہلے اجلاس کی صدارت محترمہ شوکت اعظمی نے فرمائی جب کہ دوسرے اجلاس کی صدارت یوسف ناظم نے کی۔ انھوں نے اپنے خطبے میں کہا کہ کلاسیکی ادب کے مطالعے کے بغیر نہ تو ہم ادب سمجھ سکتے ہیں اور نہ ہی زبان۔ لہٰذا ہمیں کلاسیکی ادب کا مطالعہ کرنا چاہیے۔ تیسرا اجلاس مشہور فلم رائٹر اور ڈرامہ نگار جاوید صدیقی کی صدارت میں ہوا۔ انھوں نے افسوس کا اظہار کیا کہ ترقی پسند تحریک سے متعلق کتابوں میں صرف شاعروں اور افسانہ نگاروں پر صفحے کے صفحے سیاہ کیے گئے ہیں ڈراموں اور اپٹا کی خدمات کا ذکر نہیں ہوتا ہے۔ ہمارے نقادوں کو غور کرنا چاہیے کہ ترقی پسند تحریک محض چند شاعروں اور افسانہ نگاروں کا تذکرہ نہیں ہے۔

چوتھے اجلاس کی صدارت محترمہ شمع زیدی نے کی۔ انھوں نے مقالہ نگاروں اور سیمینار کے موضوع کی تعریف کی۔ مقالہ نگاروں میں سلمیٰ صدیقی، ڈاکٹر خورشید نعمانی، محمود ایوبی، عبدالاحد ساز، اسلم پرویز، مظہر سلیم، ماجد قاضی اور معترہ قاضی وغیرہ تھے۔ کچھ مقالوں پر سلام بن رزاق، ساجد رشید، یعقوب راہی، احمد وصی، شمیم عباس، الیاس شوقی اور رحمٰن عباس وغیرہ نے اپنے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ اکثر مقالے ندرت اور تازگی کی عمدہ مثال تھے۔ اہل ذوق سامعین او رطالب علموں سے ڈیڑھ سو کرسیوں والا ہال بھرا ہوا تھا۔ شکریے کی رسم پر سیمینار کا اختتام ہوا۔ (ڈاک سے)

ہریانہ میں ابتدائی جماعتوں کے لیے اردو نصاب کی تیاری

● پنچکولہ! محبان اردو کے لیے یہ خبر حوصلہ افزا ہے کہ ہریانہ کے پرائمری اسکولوں کے لیے درجہ ایک سے پانچویں تک کے لیے اردو کے نصاب کی تیاری کا کام شروع کر دیا گیا ہے۔ اس سلسلے میں ماہرین اردو کی پہلی میٹنگ ہریانہ اردو اکادمی کے دفتر میں 29 اپریل 2008 کو منعقد ہوئی جس کی صدارت جناب شورمن گوڑ (آئی اے ایس) کمشنر ہائر ایجوکیشن ہریانہ نے کی۔ انھوں نے کہا کہ حکومت ریاست میں اردو کے فروغ کے لیے ضروری اقدام کر رہی ہے اور یہ میٹنگ اس سلسلے کی پہلی کڑی ہے۔ میٹنگ میں ماہرین کے طور پر جن لوگوں نے شرکت کی ان میں ڈاکٹر خسرو متین، ڈاکٹر خوشحال زیدی، ڈاکٹر نگار عظیم، محترمہ جمال پروین، ڈاکٹر رانا گنوری، جناب مہندر پرتاپ چاند، جناب ادم پرکاش پنوار، ڈاکٹر رینو بہل، ڈاکٹر فرزانہ نسیم، جناب نسیم تبریزی اور ڈاکٹر محمد ایوب خاں شامل تھے۔

اکادمی کے سکریٹری جناب کشمیری لال ذاکر نے کہا کہ ہریانہ میں اردو زبان کے فروغ کے لیے یہ ایک ابتدائی اقدام ہے جس کی شروعات میوات کے پرائمری اسکولوں سے کی جائے گی اس سے اردو کے فاصلاتی کورس کو بھی تقویت ملے گی جو ہریانہ اردو اکادمی کی جانب سے جلد ہی شروع کیا جا رہا ہے جس میں اردو سیکھنے والوں کے لیے عمر کی کوئی حد مقرر نہیں ہوگی۔ (ڈاک سے)

مقابلۂ غزل سرائی برائے اساتذہ

● بھیونڈی۔ 18 فروری 2008 بروز پیر شب میں نو بجے، غلام محمد کالج ہال بھیونڈی میں بزمِ علم و ادب کی جانب سے ''مقابلۂ غزل سرائی برائے اساتذہ کا اہتمام کیا گیا۔ اس پُر کیف محفل کی صدارت کوکن مسلم ایجوکیشنل سوسائٹی کے سربراہ جناب اسلم فقیہہ نے کی۔ روزنامہ ''انقلاب'' ممبئی کے مدیر جناب شاہد لطیف نے خصوصی مہمان کی حیثیت سے تقریب کو رونق بخشی۔ محترم رمضان بھائی اور جناب عبدالرشید شیخ صاحب مقابلۂ غزل سرائی میں جج کے منصب پر فائز کیے گئے تھے۔ جناب مصدق پٹیل، جناب شفیع مقری، جناب دانیال قاضی جناب پرویز سردار اور روزنامہ ''انقلاب'' کے معاون مدیر جناب قطب الدین شاہد تقریب کے مہمانانِ اعزازی تھے۔

پروگرام کے آغاز میں رئیس ہائی اسکول کے طالب علم جنید عبدالمجید مومن نے ''حمد'' پیش کی۔ بزم کے پروپیگنڈہ سکریٹری جناب مخلص مدعو نے مہمانوں کا استقبال کیا اور سکریٹری جناب عبدالعزیز انصاری نے بزمِ علم و ادب کی سرگرمیوں کی مختصر مگر جامع روداد پیش کی۔ اس موقع پر جنوری 2008 کو منعقدہ مرحوم شفیق انصاری میموریل انٹر کالجیٹ مضمون نویسی مقابلے کے دس انعام یافتگان کو انعامات بھی پیش کیے گئے۔ بزم کے صدر جناب رفیع انصاری نے پروگرام کی غرض و غایت بیان کی۔ جناب ساجد انصاری نے مقابلے کے اصول وضوابط پڑھ کر سنائے۔ اساتذہ کی غزل سرائی سے قبل امیر حمزہ ثاقب نے ''تمہیدی غزل'' پیش کی۔ جناب عامر صدیقی نے غزل گوئی سے غزل سرائی تک کے مدارج کے ذکر کے ساتھ مقابلے کا آغاز کیا۔ مقابلے میں شہر پڑگھا، مہاپولی اور بھیونڈی کے مختلف اردو میڈیم ہائی اسکولوں کے 18 اساتذہ اور سرپرستوں نے حصہ لیا۔ ہال باذوق خواتین وحضرات سے از اول تا آخر بھرا رہا۔ اکثر سامعین اردو غزلوں سے محظوظ ہونے کے ساتھ ساتھ مسحور ہوتے بھی دیکھے گئے۔

محفل سے خطاب کرتے ہوئے جناب شاہد لطیف نے کہا کہ ''بے شمار مسائل اردو کے دامن سے خاردار جھاڑیوں کی طرح الجھے ہوئے ہیں۔ اردو کی درمیانی نسل کو اپنی زبان کی حفاظت کا فریضہ بحسن وخوبی انجام دینے کے بعد مطمئن نہیں ہوجانا چاہیے بلکہ اسے نئی نسل تک پہنچانے کا معقول و مناسب انتظام بھی کرنا ہے اور اس سلسلے میں ہم میں سے ہر ایک کو اپنی ذمے داری نبھانی ہے۔'' جناب شفیع مقری نے بزمِ علم و ادب کی سرگرمیوں کو سراہتے ہوئے کہا کہ بزم کے توسط سے اساتذہ میں یک جہتی کا ایک نیا ماحول بنا ہے جو بڑی خوش آئند بات ہے۔ جناب دانیال قاضی نے بزم علم وادب کی پیش رفت کو خراج پیش کیا اور اس کے لیے اپنے تعاون کا یقین بھی دلایا۔ اس موقع پر مشہور رہبرِ فن جناب رمضان بھائی (فیس) نے اپنی تقریر میں چند مفید مشوروں سے نوازا۔ ججوں کے فیصلے کے مطابق رفیع الدین فقیہہ گرلز ہائی اسکول کے استاد جناب شبیر فاروقی کو پہلے انعام کا مستحق قرار دیا گیا۔ آپ نے مجروح سلطانپوری کی غزل '' مجھے سہل ہوگئیں منزلیں۔۔۔۔ اپنی مترنم آواز میں پیش کی۔ دوسرا انعام رفیع الدین فقیہہ بوائز ہائی اسکول کے استاد جناب شیخ عقیل احمد نے حاصل کیا۔ آپ نے راز الہ آبادی کی غزل '' آشیاں جل گیا، گلستاں لٹ گیا، خوش الحانی سے پیش کی۔ تیسرا انعام رئیس جونیئر کالج کے استاد جناب مدثر شیخ نے حاصل کیا۔ آپ نے تیغ الہ آبادی کی غزل '' کسی اور غم میں اتنی خلشِ نہاں نہیں ہے۔ پیش کی۔ غزل سرائی مقابلے کا چوتھا انعام سابق استاد جناب اعجاز مومن کے حصے میں آیا۔ آپ نے خمار بارہ بنکوی کی غزل '' سنا ہے ہمیں وہ بھلانے لگے ہیں، اپنے مخصوص انداز میں سنائی۔ رفیع الدین بوائز ہائی اسکول کے استاد جناب امتیاز احمد محمد امین پانچویں انعام کے حقدار قرار دیے گئے۔ آپ نے فیض کی غزل'' گلوں میں رنگ بھرے۔۔۔'' کو اپنی مخصوص لے میں پیش کیا۔

بزم کے سرپرست جناب فیضان احمد ہیڈ ماسٹر رئیس ہائی اسکول و جونیئر کالج نے تمام شرکا کی خدمت میں مومنٹو اور مہمانوں کی خدمت میں تحائف پیش کیے۔ بزم کے سکریٹری جناب عبدالعزیز انصاری کے اظہارِ تشکر پر تقریب کا اختتام ہوا۔ (ڈاک سے)

اردو املا اور حروف تہجی سے متعلق لسانی تحقیق

● اردو حروف تہجی کا المیہ یہ ہے کہ ابھی تک اس کے حروف کی ترتیب اور تعداد کا حتمی یقین نہیں ہوسکا ہے۔ حروف تہجی کی ترتیب وتعداد کے لیے اگر اردو قاعدوں (Primers) کو دیکھا جائے تو ہمیں حروف کی تعداد 35 سے 41 تک ملتی ہے۔ حروف تہجی کی تعداد میں علما کے یہاں بھی یکسانیت نہیں پائی جاتی ہے۔ انشاء اللہ خاں انشا اردو حروف تہجی کی تعداد پچاسی (85) بتاتے ہیں تو مولوی عبدالحق پچاس مانتے ہیں اور دتاتریہ کیفی صرف اڑتالیس حروف پر اکتفا کرتے ہیں۔ غرض یہ کہ صدیوں کے بعد بھی اردو حروف تہجی کی تعداد اور ترتیب حتمی طور پر متعین نہیں ہوسکی۔ یہ تدریس زبان کے ساتھ تدوین لغت کا اہم مسئلہ ہے جس کا حل ہم ابھی تک تلاش نہیں کرسکے ہیں۔ بہت سے اردو الفاظ کی املا کا بھی تعین نہیں ہوسکا ہے۔ اس وجہ سے بہت سے الفاظ کی املا میں غیر یکسانیت پائی جاتی ہے۔ کمپیوٹر کے عہد میں اس طرح کی کمیاں اردو کے کمپیوٹر سافٹ ویئر کی تیاری میں حائل ہوتی ہیں۔ املائی غیر یکسانیت کی وجہ سے املائی معائنہ کار (Spell Checker)، تواتر شماری الفاظ (Word

(Frequencey Count لغاتی ترتیب (Sorting Order) کا کامیاب سافٹ ویئر نہیں تیار کرسکتے، یا اسے تیار کرنے کے بعد بہت سی کمیاں رہ جاتی ہیں۔ کمپیوٹر کے نقطۂ نظر سے الفاظ کے وصل وفصل کا مسئلہ بھی اہمیت کا حامل ہے۔ ان خیالات کا اظہار پروفیسر علی رفاد فتیحی نے سہ روزہ بھوپال دورہ کے درمیان اپنے خطاب میں مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کے ریجنل سینٹر بھوپال میں کیا۔ اس موقع پر مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، بھوپال کے ریجنل ڈائرکٹر ڈاکٹر محمد احسن نے پروفیسر فتیحی کو ایک مومنٹو بھی پیش کیا۔

اے۔ایم۔یو کے شعبۂ لسانیات کے تحقیق کاروں کا ایک وفد پروفیسر علی رفاد فتیحی کی رہنمائی میں 30 مارچ کو بھوپال آیا اور 4 اپریل تک بھوپال شہر کے مختلف علاقوں کا دورہ کیا جن میں خاص طور سے سرائے منشی حسین خاں، بدھوارہ، اتوارہ، اسلام پورہ، عیش باغ، جہانگیر آباد، امامی گیٹ، پیر گیٹ، نورمحل، ابراہیم پورہ اور رپائیگا شامل ہیں۔ اس دورے کا خاص مقصد بھوپال جیسے اہم شہر میں ظاہر ہونے والی لسانی تبدیلی کا تجزیہ کرنا تھا۔ تحقیق کے دوران ریسرچ اسکالرز نے محسوس کیا کہ ہندی اور اردو جیسی ہندوستان کی خاص زبانیں کافی قریب آئی ہیں اور ان کے بولنے والوں کے درمیان کسی بھی طرح کی لسانی رکاوٹ نہیں ہے جو اس بات کا ثبوت ہے کہ بھوپال گنگا جمنی تہذیب کا گہوارہ ہے۔ انھوں نے یہاں کے لسانیاتی ماحول کو سمجھنے کے لیے سانچی جیسے تاریخی آثارِ قدیمہ کا مشاہدہ بھی کیا اور اس نتیجے پر پہنچے کہ بھوپال قدیم زمانے سے ہی زبان کے ماہرین کے لیے ایک اہم جگہ رہی ہے۔ (ڈاک سے)

طالبات تعلیم کی ترویج واشاعت میں حصہ لیں

● علی گڑھ۔ 24 اپریل، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر پروفیسر پی کے عبدالعزیز نے طالبات کے بہترین علمی وفنی مظاہرے کی تعریف کرتے ہوئے کہا کہ انھیں تعلیم کے میدان میں مزید محنت کرنی چاہیے کہ وہ تعلیمی اداروں اور انتظامی عہدوں پر بڑی تعداد میں فائز ہوسکیں۔ انھوں نے ان خیالات کا اظہار آج علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے عبداللہ ہال کے زیر اہتمام منعقد ادبی، ثقافتی اور کھیل کود مقابلہ ''طرب 2008'' کی اختتامی وتقسیم انعامات کی تقریب سے خطاب کرتے ہوئے کیا۔ انھوں نے کہا کہ یونیورسٹیوں میں خواتین وائس چانسلرس کی بھی تقرری ہونی چاہیے تاکہ خواتین کی ہر طرح ترقی ممکن ہوسکے۔ پروفیسر عزیز نے عبداللہ ہال کی پرووسٹ پروفیسر بلقیس تسیم وارث کی کارگزاریوں اور کاوشوں کو سراہتے ہوئے کہا کہ ان کے ہال کی سرگرمیوں میں دلچسپی لینے سے ہی طالبات کے رہن سہن اور ڈسپلن کو استحکام حاصل ہوا ہے۔ انھوں نے ہال کی ترقی اور مسائل کے حل کے لیے مستقبل میں زائد رقم مہیا کرائے جانے کا بھی یقین دلایا۔ تقریب کے اعزازی مہمان یونیورسٹی کے سابق پرو وائس چانسلر ایم سلیم الدین نے مسلم تعلیم اور تعلیم نسواں پر خصوصی طور پر زور دیتے ہوئے کہا کہ آج ہمارے سماج اور خصوصی طور پر مسلم سماج کی خواتین تعلیم کے میدان میں کافی پسماندگی کا شکار ہیں۔ ایم سلیم الدین نے توقع ظاہر کی خاتون وائس چانسلر بننے سے طالبات کے مسائل کا حل مزید آسانی سے ممکن ہوسکے گا۔ پروفیسر سلیم الدین نے طالبات سے اپیل کی ہے کہ وہ اپنے علاقوں میں جاکر تعلیم کی ترویج واشاعت کریں اور خواتین کو اس کی اہمیت سے روشناس کرائیں۔ (راشٹریہ سہارا، نئی دہلی)

احمد سعید ملیح آبادی کا جامعہ ملیہ اسلامیہ میں استقبال

● نئی دہلی۔ 25 اپریل، ہندوستان میں اردو بولنے والوں کو اردو کا سفر توقعات سے نہیں صرف اشتراک عمل سے منزل آشنا کرسکتا ہے۔ اقتدار کے ایوان بالا میں ایک منتخب نمائندے کی حیثیت سے قدم رکھنے والے ممتاز اردو صحافی اور روزنامہ آزاد ہند کے ایڈیٹر احمد سعید ملیح آبادی نے یہ خیال یہاں جامعہ ملیہ اسلامیہ میں ایک استقبالیہ تقریب میں ظاہر کیا جس کا اہتمام کل شام اردو پریس کلب نے کیا تھا۔ انھوں نے کہا کہ انھیں اس بات کی خوشی ہے کہ وہ راجیہ سبھا میں علاقائی سطح پر مغربی بنگال اور قومی سطح پر اردو اور مسلمانوں کے کاز کے لیے آواز بلند کرنے کے لیے کسی سیاسی نظریے یا پارٹی وہپ کے پابند نہیں ہوں گے۔ احمد سعید ملیح آبادی نے شعبۂ ہائے زندگی کے نمائندوں سے خطاب کرتے ہوئے خواہشوں، امنگوں اور آرزوؤں کی نفی کیے بغیر کہا کہ زندگی بہرحال بنیادی طور پر عمل سے عبارت ہے اور سچر کمیٹی کی رپورٹ اس کی طرف واضح اشارہ کرتی ہے۔ انھوں نے کہا کہ اردو بالخصوص اردو صحافت کو درپیش مسائل کے حل کے لیے جس اشتراک عمل کی ضرورت ہے وہ صرف ایک اردو ایڈیٹرس کانفرنس سے یا اردو کے چند نمائندوں کے ایوان اقتدار تک پہنچ جانے سے پوری نہیں ہوگی۔ اس کارزار میں جدوجہد کے لیے کمان دار کے پیچھے مجاہدوں کا غول بھی ہونا چاہیے۔ انھوں نے کہا کہ بہرحال حالات اتنے مایوس کن نہیں۔ ضرورت صرف بیداری اور اس جوش وجذبے کی ہے جس کے نتیجے میں آج یہ ملک آزاد ہے۔ پروفیسر اختر الواسع نے کہا کہ راجیہ سبھا کے لیے مدیر آزاد ہند کا انتخاب ان کے لیے باعث مسرت کم اور ایوان بالا کے لیے موجب افتخار زیادہ ہے کیونکہ احمد سعید ملیح آبادی ان صحافیوں میں سے ایک ہیں جنھوں نے قلم کو امانت حق سمجھا اور ہندوستان کی آزادی کے بعد اردو صحافت کا رخ آزاد ہندوستان کے تقاضوں کی تکمیل میں اپنا کردار ادا کرنے کی طرف موڑا۔ ایم سی آر سی کے صدر فردین ماتھر نے اردو اخبارات کو درپیش مسائل کے حل کی

عملی صورتوں کا جائزہ لیا اور حکومت اور حکومتی اداروں سے فیض اٹھانے کی منصوبہ بندی پر زور دیا۔ اردو فکشن کو خوش جہت بنانے والے ادیب پیغام آفاقی نے صحافت میں صحت مند خبر نگاری کی بحالی پر زور دیا اور امید ظاہر کی احمد سعید ملیح آبادی کی ایوان بالا میں موجودگی اردو صحافت کو مجموعی طور پر معاشرتی ذمے داری سے قریب تر کرنے میں معاون ثابت ہوگی۔ مسٹر اے آر شاہین نے کہا کہ وہ احمد سعید صاحب کی تجاویز اور خیالات سے اتفاق کرتے ہیں اور ان کی کوشش ہوگی کہ وہ اردو زبان وصحافت کے علاوہ قومی اور علاقائی سطح پر اقلیتوں کے امور کے تعلق سے کیے جانے والے عملی اقدامات کو موثر بنانے میں بھرپور اشتراک کریں۔ اردو پریس کلب کے جنرل سکریٹری طارق فیضی نے انتہائی کم وقفے سے تقریب کے اہتمام میں شرکا کے تعاون کا شکریہ ادا کیا اور امید ظاہر کی کہ یہ کوشش اردو والوں کو عملاً میدان عمل تک لے جائے گی۔ (ہمارا سماج، دہلی)

''ہجر وفراق کی نظمیں''

● علی گڑھ۔ 22 اپریل، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے کینیڈی ہال آڈیٹوریم میں یونیورسٹی لٹریری کلب جی ای سی کی جانب سے مشہور شاعر منیب الرحمٰن کے تازہ مجموعۂ کلام ''ہجر وفراق کی نظمیں'' کی استقبالیہ تقریب منعقد ہوئی۔

اس موقع پر اپنی صدارتی تقریر میں اردو کے معروف شاعر پروفیسر شہریار نے منیب الرحمٰن سے اپنی دیرینہ رفاقت کا ذکر کرتے ہوئے ان کی تازہ نظموں کے مجموعے کو اردو شاعری کی بہترین مثالوں میں سے ایک قرار دیا۔ انھوں نے کہا کہ اگرچہ یہ نظمیں منیب الرحمٰن نے اپنی اہلیہ کی وفات پر لکھی ہیں اور یہ تکنیکی لحاظ سے شخصی مرثیے کے ذیل میں آتی ہیں لیکن منیب الرحمٰن کی فنی مہارت نے ان نظموں میں ایک آفاقی شان پیدا کردی ہے۔ انھوں نے کہا کہ منیب الرحمٰن کے اس کمال نے ان شخصی نوعیت کی نظموں کو اعلیٰ درجے کا ادب پارہ بنادیا ہے۔

اس موقع پر مہمان خصوصی منیب الرحمٰن نے اپنی منتخب نظمیں سامعین کی فرمائش پر اپنے مخصوص انداز میں پڑھ کر سنائیں۔ اس سے قبل شعبۂ اردو کے استاد ڈاکٹر امتیاز احمد، شعبۂ لسانیات کے صدر پروفیسر اے آر فتیحی اور جی ای سی کے کوآرڈینیٹر اور آرٹس فیکلٹی کے ڈین پروفیسر ابوالکلام قاسمی نے منیب الرحمٰن کی نظموں اور بطور خاص ''ہجر وفراق کی نظمیں'' پر تنقیدی و تجزیاتی نوعیت کے مضامین پڑھے۔

تمام تجزیہ نگاروں نے منیب الرحمٰن کو عصر حاضر کا باکمال اور منفرد شاعر قرار دیا۔ جلسے کی نظامت شعبۂ اردو کے استاد اور یونیورسٹی لٹریری کلب کے صدر ڈاکٹر سراج اجملی نے کی۔ جلسے میں یونیورسٹی کے اساتذہ، ناقدین، شعرا اور ریسرچ اسکالرس نے بڑی تعداد میں شرکت کی جن میں پروفیسر عرفان حبیب، پروفیسر رضوان حسین، پروفیسر زاہدہ زیدی، پروفیسر اطہر صدیقی، پروفیسر افتخار عالم خاں، پروفیسر خورشید احمد، پروفیسر عقیل احمد، ڈاکٹر مہتاب حیدر نقوی، سریش کمار وغیرہ شامل تھے۔ (راشٹریہ سہارا، نئی دہلی)

یادرفتگاں

● میرٹھ۔ 6 مئی، ''علی باقر نے اپنے تجربات ومشاہدات کو استعمال کرتے ہوئے افسانے تخلیق کیے اور موافق سمت چلنے کے بجائے Trend کی مخالف سمت چلے اور اسی لیے وہ ایک بہترین افسانہ نگار ہیں۔ باقر صاحب کا متن اور فارم کے بارے میں ایک نیا نظریہ تھا'' یہ الفاظ معروف اداکار و ہدایت کار ایم کے رینا کے ہیں۔ وہ شعبۂ اردو چودھری چرن سنگھ یونیورسٹی کے پریم چند سیمینار ہال میں منعقدہ سیمینار بعنوان ''علی باقر کی افسانوی کائنات'' میں مہمان خصوصی کی حیثیت سے خطاب کررہے تھے۔

جواہر لعل یونیورسٹی سے تشریف لائے ہوئے ڈاکٹر انور پاشا نے کہا کہ علی باقر ان لوگوں میں سے تھے جنھوں نے انسانی اقدار اور عالمی سماج کی قدروں کو بنیاد بنا کر اپنے افسانے میں عورت کی نفسیات اور مختلف شیڈس کو پیش کیا۔ وہ انسانی قدروں کی تلاش میں سرگرداں نظر آتے ہیں۔ ڈاکٹر پاشا نے مزید کہا کہ عظیم فنکار مثبت انسانی قدروں کی حمایت کرتا ہے اور اپنی زندگی میں انھیں برتتا بھی ہے۔ علی باقر نے اسے عملی طور پر کر دکھایا۔ دہلی یونیورسٹی کے صدر شعبۂ اردو ڈاکٹر ارتضیٰ کریم نے کہا کہ وہ ایک سچے ترقی پسند ادیب تھے۔ علی باقر صاحب کی اہلیہ پروفیسر نجمہ باقر نے کہا کہ وہ ایک اچھے، سچے اور خوددار انسان تھے۔ انھیں رشتوں کا پاس تھا، جبھی کے ساتھ عزت واحترام کے ساتھ پیش آتے تھے۔ ان کا یہ روپ ان کے افسانوں میں بھی جابجا ملتا ہے۔ صدر جلسہ ڈاکٹر اسلم جمشید پوری نے کہا بہت کم لوگ ہوں گے جو ادب کی تخلیق کے ساتھ جسمانی اور ذہنی سطح پر معذوروں کے مسائل کی طرف متوجہ ہوئے ہوں۔ علی باقر نے معذوروں کے لیے نہ صرف سوچا بلکہ عملی طور پر این جی او قائم کرکے، ٹیلی سیریل ''ایک گھر آس پاس'' بنا کر اور Disability پر متعدد کتب اور مضامین رقم کرکے عملی کام کیا ہے۔

سیمینار کا افتتاح پروفیسر ارچنا شرما (ڈین فیکلٹی آف آرٹس، سی سی ایس یونیورسٹی) نے شمع جلا کر کیا۔ اس کے بعد فرقان احمد نے کلام پاک کی تلاوت کی۔ ڈاکٹر علاء الدین نے مہمانان خصوصی اور سامعین کا استقبال کیا۔ سیمینار میں رضوان احمد نے ''علی باقر: ایک جائزہ'' زمرد مغل نے ''علی باقر اور ہجرت''، ''ڈاکٹر احمد کفیل نے'' علی باقر کے افسانوں میں ہجرت کا المیہ''، ڈاکٹر

محمد ارشد علیگ نے'' علی باقر کے افسانوں میں تہذیبی شکست و ریخت'' اور ڈاکٹر علاء الدین خاں نے'' علی باقر کی افسانوی کائنات'' مقالے پیش کیے۔

سیمینار کے آخر میں علی باقر کے افسانے پر مشتمل ٹیلی فلم'' بہروپ'' کی نمائش کی گئی۔ سیمینار کی نظامت ظفر گلزار نے کی۔ (ڈاک سے)

● جمشید پور۔ شہر کے فعال ادبی ادارے'' اردو قبیلہ'' کے زیر اہتمام 24 فروری کو شام چار بجے کریم سٹی کالج کے ہال میں'' ایک شام منظر کاظمی کے نام'' منعقد ہوئی۔ اس موقع پر ہر سال کسی ایک ادیب کو منظر کاظمی قومی ایوارڈ سے نوازا جاتا ہے۔ اس سال چھٹا منظر کاظمی قومی ایوارڈ ملت کالج متصلا یونیورسٹی دربھنگہ میں اردو کے لکچرر جناب جمال اویسی کو دیا گیا۔ انھیں یہ ایوارڈ ان کی شاعری اور تنقید کے حوالے سے دیا گیا ہے۔ اس موقع پر منظر کاظمی کے مجموعۂ مضامین'' مقالات منظر'' کی رونمائی بھی ہوئی۔ رونمائی کی رسم مہمان خصوصی ڈاکٹر محمود عالم کے ہاتھوں ادا ہوئی۔'' مقالات منظر'' کو ڈاکٹر افسر کاظمی صدر اردو قبیلہ نے مرتب کیا ہے۔

ڈاکٹر محمود عالم نے کہا کہ مرحوم منظر کاظمی صرف ایک شخصیت کا نام نہیں بلکہ اس ایک شخصیت میں کئی اور شخصیتیں پنہاں تھیں۔ منظر کاظمی جتنے بڑے افسانہ نگار تھے اتنے ہی بڑے مفکر اور انتظامی صلاحیت کے مالک بھی تھے۔ '' مقالات منظر'' کے حوالے سے انھوں نے کہا کہ اس کتاب کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ منظر کاظمی کا ذہن کہاں کہاں کام کرتا تھا۔ اور کتنی گہری سوچ تھی اس شخص کی۔ اس موقع پر رضوان واسطی نے اپنا ایک مختصر مقالہ پیش کیا۔ انھوں نے کہا کہ منظر کاظمی نے جس حادثے کا اشارہ 1991 میں کیا وہ 2002-3 میں عراق میں رونما ہوا اور ان کی پیش گوئی سچ ثابت ہوئی۔ پروفیسر یحیٰ ابراہیم نے منظر کاظمی کا مضمون'' مگر سچ کون بولے گا'' پڑھ کر سنایا۔

(ڈاک سے)

● جے پور۔ 19 اپریل، کو چیمبر آف کامرس میں'' راہی شہابی فن اور شخصیت'' کے عنوان سے آل انڈیا سیمینار منعقد کیا گیا۔ سیمینار میں ممبئی سے عبدالاحد ساز، بھوپال سے نصرت مہدی، مراد آباد سے منصور عثمانی، دہلی سے مخمور سعیدی، ٹونک سے صاحبزادہ شوکت علی خاں، جے پور سے ڈاکٹر زینت کیفی، ملک نسیم اور ڈاکٹر مجیب نے اپنے مقالے پیش کیے شرکا نے راہی شہابی کی شاعری کو عصرِ حاضر کی نمائندہ شاعری قرار دیا اور کہا کہ راہی شہابی کی فکر موجودہ دور کے مسائل کو شاعری کی آواز بنانے کا فن اور عالمی منظر نامے کی دھمک محسوس کرنے کا نام تھا۔ صاحبزادہ شوکت علی خاں نے راہی شہابی سے اپنے تعلقات کے حوالے سے اپنی بات کہی۔ مخمور سعیدی نے راہی صاحب سے اپنے دیرینہ تعلقات کا جو قریب قریب 40 برس پر محیط تھے ذکر کرتے ہوئے راہی صاحب کو نظم کے حوالے سے آزادی کے بعد ہندوستان کا اہم شاعر کہا۔ آپ نے فرمایا، پابند نظموں میں جو نئی فکر اور جہت راہی کی شاعری میں نظر آتی ہے وہ کہیں اور دیکھنے کو نہیں ملتی راہی شہابی نے جہاں بدلتی ہوئی سماجی قدروں، ٹوٹتے رشتوں سماج میں پھیلی ناہمواریوں اور سیاسی نظریوں کے زوال کو موضوع سخن بنایا وہیں نئی نسل کو ایک رجحان ایک فکر دینے کی کوشش کی۔ وہ اتنی خوبصورتی سے اپنی بات کہتے تھے کہ مشاعرے میں سامعین گھنٹوں تک ان کی شاعری کو سنتے اور سر دھنتے تھے صفحۂ قرطاس پر جب ان کی شاعری پڑھنے کو ملتی تھی تو نئے امکانات نظر آتے تھے۔

آخر میں راہی صاحب کے صاحبزادے وجاہت علی خاں نے تمام شرکا اور سامعین کا شکریہ ادا کیا سیمینار تین سیشن پر مشتمل تھا۔ (ڈاک سے)

● ممبئی۔ مہاراشٹر اسٹیٹ اردو ساہتیہ اکادمی اور شعبۂ اردو ممبئی یونیورسٹی کے زیر اہتمام'' سیتو مادھوراؤ پگڑی شخص مورخ و ادیب'' کے موضوع پر ممبئی یونیورسٹی کے فیروز شاہ مہتا بھون میں 3 مئی 2008 کو یک روزہ قومی سیمینار کا انعقاد کیا گیا۔ سیمینار کا افتتاح سابق صدر شعبۂ تاریخ ممبئی یونیورسٹی پروفیسر جے، وی، نائک، نے اپنے خطاب سے کیا۔ اردو اکادمی کے چیئرمین پروفیسر عبدالستار دلوی نے اپنے کلیدی خطبے میں کہا کہ پگڑی صاحب نے اردو مراٹھی کے درمیان ایک سیتو کا کام کیا ہے اور ان زبانوں کے مابین رشتوں کو مضبوط بنانے میں اہم رول ادا کیا۔ صدارت جناب این، این پٹیل سابق کمشنر برائے ثقافتی امور، حکومت مہاراشٹر نے کی۔ انھوں نے مغلوں اور مراٹھوں کے رشتوں پر پگڑی صاحب کے خیالات پر گفتگو کی۔ ڈاکٹر قاسم امام ممبر سکریٹری اردو اکادمی نے مہمانوں کا استقبال کیا۔ سیمینار کے کنوینر اور ممبر اکادمی انور اعظمی کے شکریے پر پہلے سیشن کا اختتام ہوا۔

دوسرے اور تیسرے سیشن میں پگڑی صاحب کی شخصیت اور فن پر مقالے مضامین اور تقاریر ہوئیں۔ جس میں پگڑی صاحب کے صاحبزادے اشوک پگڑی، ڈاکٹر داؤد دلوی، حیدرآباد سے آئی ہوئی مہمان پروفیسر فاطمہ بیگم، ڈاکٹر رام پنڈت، محمد حسین پرکار، وقار قادری اور منیشا پٹوردھن نے حصہ لیا۔ وقار قادری اور عباس مجتہد نے نظامت کے فرائض انجام دیے۔

ڈاکٹر صاحب علی کے شکریے پر سیمینار اختتام پذیر ہوا۔ (ڈاک سے)

مختصرات

● کانپور۔ 31 مارچ، خسرو کبیر فاؤنڈیشن نے اتر پردیش اردو اکادمی کا مجموعی ادبی خدمات ایوارڈ حاصل کرنے پر جناب نامی انصاری کو خراج تحسین پیش کرنے کے لیے اسلامک نرسری اسکول میں ایک تہنیتی جلسے کا

انعقاد کیا۔ جس میں شہر کی مقتدر ادبی ہستیاں موجود تھیں۔ اتر پردیش اردو اکادمی کا یہ ایوارڈ برائے سال 2007 اکیاون ہزار روپے نقد اور توصیفی سند پر مشتمل ہے۔

فاؤنڈیشن کے جنرل سکریٹری خان احمد فاروق نے کہا کہ نامی انصاری صرف کانپور ہی میں نہیں بلکہ پوری اردو دنیا میں ایک باوقار حیثیت رکھتے ہیں اور وہ بجا طور پر اس ایوارڈ کے مستحق تھے۔ گذشتہ سال لندن سے نکلنے والے ادبی جریدے ''شہزاد'' نے ان کی ادبی خدمات پر ایک خصوصی گوشہ شائع کیا تھا۔ ابھی حال ہی میں سہ ماہی ''روشنائی'' کراچی نے ان کو خراج تحسین پیش کرتے ہوئے ان پر ایک خاص گوشہ شائع کیا ہے جس میں آل احمد سرور، گوپی چند نارنگ، جمیل جالبی، مشفق خواجہ، پروفیسر قمر رئیس، سید محمد عقیل رضوی، مجتبیٰ حسین، سید محمد اشرف، یوسف ناظم اور ڈاکٹر منظر اعجاز نے نامی انصاری کی فکروفن پر اظہار خیال کیا ہے۔ نامی انصاری کی اب تک چودہ کتابیں شائع ہو چکی ہیں جن میں شاعری، تنقید، مونوگراف، بچوں کی کتابوں کے تراجم، نیز ڈوگری شاعرہ پدما سچدیوا کی شاعری اور اڑیہ کہانی کار منوج داس کی کہانیوں کے اردو تراجم شامل ہیں۔ فاؤنڈیشن کے نائب صدر سید وسیم الہاشمی نے اس جلسے کی صدارت کرتے ہوئے کہا کہ نامی انصاری صاحب اردو کے حوالے سے فخر کانپور ہیں اور ہمیں ان پر ناز ہے۔ خدا کرے وہ تادیر کام کرتے ہوئے ہمارے ساتھ رہیں۔ جلسے میں فاؤنڈیشن کے سرپرست جناب لطیف عباس، غلام مصطفیٰ فراز، نظام خاں، ڈاکٹر محمد طفیل صدیقی، ڈاکٹر محمد شعیب انصاری، ڈاکٹر محمد عارف، اسلم محمود، ڈاکٹر شوکت اسلام، یاسر عرفات، نواب حسین، لطافت حسین اور دیگر اہم شخصیات موجود تھیں۔

(ڈاک سے)

● اردو سہ ماہی توازن کے مدیر جناب عتیق احمد عتیق مالیگانوی کی ادبی اور صحافتی خدمات کے اعتراف میں حال ہی میں اسباق پبلی کیشنز پونہ کی جانب سے شہر کے ثقافتی مراکز اعظم کیمپس کے اسمبلی ہال میں ''جشن عتیق احمد عتیق'' کے تحت مختلف ادبی پروگراموں کا انعقاد عمل میں آیا۔ صبح گیارہ تا دوپہر دو بجے اعظم ٹرسٹ کے چیئرمین جناب منور پیر بھائی کے زیر صدارت جشن کے پہلے حصے میں جناب عتیق احمد کو ایک دیدہ زیب مومنٹو شال اور کیسۂ زر (گیارہ ہزار روپے) پر مشتمل اسباق ادبی ایوارڈ برائے 2008 منور پیر بھائی کے ہاتھوں تفویض کیا گیا۔ اس کے ساتھ ہی عقیدت مندان عتیق اور شہر پونہ کی ادبی انجمنوں کی جانب سے صاحب جشن کو شالوں اور گلدستوں سے شرابور کر دیا گیا۔ ''جشن عتیق'' کے کنوینر، اسباق کے مدیر نذیر فتح پوری نے افتتاحی کلمات کے تحت بتایا کہ یہ اسباق کا چھٹا ادبی ایوارڈ ہے جو عتیق صاحب کو پیش کیا گیا ہے۔

اس کے بعد نور منیری، ڈاکٹر محبوب راہی، عبدالکریم سالار، دلدار ہاشمی، قاضی مشتاق احمد، حشمت اللہ کلکتوی، عبدالاحد ساز، عبدالحفیظ اور اثر صدیقی نے اپنے اپنے منظوم و منثور خیالات کے وسیلے سے جناب عتیق کی ادبی خدمات پر روشنی ڈالی۔ جناب منور پیر بھائی نے اسباق کے مالک و مدیر نذیر فتح پوری کے اقدام کو سراہتے ہوئے عتیق صاحب کی ادبی خدمات کا بھی اعتراف کیا۔ اسی دوران اسباق کے دو شماروں، گوشۂ منظر قدوسی اور گوشۂ عتیق کے علاوہ ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی کی مرتب کردہ کتاب ''نذیر فتح پوری'' اور منظر قدوسی کے ناول ''ٹوٹ رشتے'' کا اجرا منور پیر بھائی، عابدہ انعامدار، عبدالکریم سالار اور قاضی مشتاق احمد کے ہاتھوں عمل میں آیا۔ قاضی مشتاق احمد اور ڈاکٹر حشمت اللہ کلکتوی نے منظر قدوسی کے ناول پر اپنے اپنے تاثرات پیش کیے۔ جناب رفیق قاضی نے صدر اور مہمانان کا تعارف پیش کیا۔ جلسے کی نظامت اور شکریے کے فرائض محترمہ ظل ہما نے ادا کیے۔ جناب نذیر فتح پوری کی ادبی خدمات پر اعظم ٹرسٹ کی جانب سے ٹرسٹ کے چیئرمین جناب منور پیر بھائی نے شال اور گلدستے دے کر ان کا اعزاز کیا۔ اسی روز رات میں بعد نماز عشا عبدالاحد ساز کی صدارت میں مشاعرہ ہوا جس کی نظامت کے فرائض حسام الدین شعلہ نے انجام دیے۔ مشاعرے میں جن شعرائے کرام نے اپنے کلام سے نوازا ان کے اسمائے گرامی عتیق احمد عتیق، محبوب راہی، اثر صدیقی، دلدار ہاشمی، نور منیری، شبیر فراز، عزیز ادیب، عزیز شولاپوری، اسلم چشتی، عالم فتح پوری، لطیف جوہر، تاج الدین تاج، اقبال حمید، سراج شولاپوری، یاسین براری، شمشاد شاد تاکیدار، ادھو مہاجن بسمل۔

(ڈاک سے)

● یکم مارچ 2008۔ شعبۂ اردو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں جاپان سے تشریف لائی خاتون محترمہ ڈاکٹر Hisae کے اعزاز میں ایک جلسے کا انعقاد کیا گیا جس کی صدارت پروفیسر سید محمد ہاشم نے کی۔ پروگرام کی نظامت کے فرائض پروفیسر صغیر افراہیم نے انجام دیے۔ محترمہ Hisae ہندی سے پی ایچ ڈی ہیں اور بہت سے علمی و ادبی کاموں میں مصروف رہتی ہیں۔ انھوں نے اپنے تجربات سے طلبہ و طالبات کو روشناس کرایا اور ہندوستان میں اپنی آمد پر غیر معمولی مسرت کا اظہار کیا۔ اس موقع پر شعبے کے ریسرچ اسکالر اور ایم اے کے طلبہ و طالبات بڑی تعداد میں موجود تھے جنھوں نے اپنے تاثرات اور تحقیقی کاموں کی تفصیل پیش کرنے کے ساتھ ساتھ شعر و شاعری کے ذریعے محفل کو خوبصورت اور حسین بنا دیا۔ پروفیسر صغیر افراہیم نے صدر جلسہ پروفیسر سید محمد، کی علمی اور ادبی دلچسپیوں پر روشنی ڈالی۔ آخر میں صدارتی کلمات ادا کرتے ہوئے پروفیسر ہاشم نے محترمہ Hisae کی علی گڑھ آمد پر بے انتہا خوشی کا اظہار کیا۔

(ڈاک سے)

رسم اجرا

● پٹنہ۔ 2 مئی، القلم فاؤنڈیشن سلطان گنج پٹنہ کے زیر اہتمام ڈاکٹر طلحہ رضوی برق کی 2 کتابوں ''اربعین'' اور ''سہرے ہی سہرے'' کی رسم اجرا سابق وائس چانسلر پروفیسر شمشاد حسین کے ہاتھوں عمل میں آئی تقریب کی صدارت جناب متین عمادی نے فرمائی اور نظامت کے فرائض ڈاکٹر ریحان غنی نے انجام دیے۔ پروگرام کا آغاز تلاوت کلام پاک سے ہوا۔ القلم فاؤنڈیشن کے صدر مفتی امجد رضا امجد نے خطبۂ استقبالیہ میں ڈاکٹر طلحہ رضوی برق کے تعلق سے اپنے تاثرات کا اظہار کیا پروفیسر شمشاد حسین نے ڈاکٹر برق کو اردو اور فارسی ادب کا جید عالم بتایا اور کہا کہ انھوں نے اپنی تحقیقی وتنقیدی کتابوں کے ذریعے جو مقام بنایا ہے وہ قابل ستائش ہے۔ ڈاکٹر طلحہ رضوی برق نے کہا کہ نعت عبادت ہے اور یہ عبادت بھی توفیق خداوندی پر منحصر ہے خدا نے مجھ سے نعت کہلوائی یہ میری خوش نصیبی ہے اور سرکار دو عالم ﷺ قبول فرمالیں یہ میری دلی تمنا۔

اجلاس کے صدر جناب متین عمادی کے خطبۂ صدارت اور ڈاکٹر امجد رضا امجد کے شکریے کے ساتھ تقریب کی پہلی نشست اختتام پذیر ہوئی۔ بعد از اں ایک نعتیہ شعری نشست منعقد کی گئی جس کی صدارت ڈاکٹر طلحہ رضوی برق اور نظامت کے فرائض واحد نظیر نے انجام دیے۔ (قومی تنظیم، پٹنہ)

● 13 اپریل 2008 کو معروف شاعر جناب رہبر جونپوری کی تازہ تصنیف ''پیغام حق'' (منظوم تاریخ اسلام ختم نبوت تک) کی رسم اجرا مولانا عبداللطیف خاں قاضی شہر بھوپال کے ہاتھوں انجام پائی۔ جلسے کی صدارت پروفیسر آفاق احمد نے کی بطور مہمان خصوصی معروف ومقبول شاعر جناب رفعت سروش دہلی سے اس جلسے میں شرکت کے لیے تشریف لائے۔ جلسے کے دوسرے مہمان ذی وقار حاجی ہارون ایڈوکیٹ، صدر مدھیہ پردیش کانگریس کمیٹی اقلیتی شعبہ تھے تقریب کی ابتدا تلاوت کلام پاک سے ہوئی جو حافظ سید محمود نے کی۔ نظامت کے فرائض پروفیسر سعید اختر نے انجام دیے۔

''پیغام حق'' کو رہبر صاحب نے ''بطرز آلھا'' لکھا ہے۔ جلسے میں جناب رفعت سروش جناب کوثر صدیقی، جناب رشید انجم، ڈاکٹر رضیہ حامد اور محترمہ ممتاز صدیقی نے رہبر جونپوری کی اس تخلیق پر اپنے مضامین پڑھے۔ انھوں نے رہبر جونپوری کی اس کاوش کو اردو ادب میں اضافہ قرار دیا۔ مولانا عبداللطیف خاں صاحب اور صدر جلسہ پروفیسر آفاق احمد نے اس نئے انداز میں اور آسان زبان میں لکھی گئی منظوم تاریخ اسلام کی اس دور میں اہمیت اور ضرورت پر روشنی ڈالی۔ رہبر جونپوری کی نظم بھوپال سے نکلنے والے اخبار صدائے اردو پندرہ روزہ میں مسلسل چار سال شائع ہوئی اور مقبول خاص و عام ہوئی۔ اس موقع پر رہبر جونپوری نے ''پیغام حق'' سے حجتہ الوداع'' اور رسول اکرمؐ کے آخری خطبے کو پڑھ کر سنایا جسے جلسے میں موجود حضرات نے کافی پسند کیا۔ (ڈاک سے)

● پٹنہ۔ 10 اپریل، بزم عشرت موتیہاری و علمی مجلس بہار کے زیر اہتمام اردو بھون پٹنہ کے سیمینار ہال میں جناب ظفر مجیبی کے تیسرے شعری مجموعے ''دھوپ کے سائے میں'' کا اجرا پروفیسر شمشاد حسین سابق وائس چانسلر مگدھ یونیورسٹی کے ہاتھوں انجام پایا۔ محفل کی صدارت پروفیسر وہاب اشرفی نے کی جبکہ نظامت کے فرائض نسیم احمد نسیم نے انجام دیے۔

تلاوت کلام پاک سے پروگرام کا آغاز ہوا۔ اجرا کے بعد علمی مجلس بہار کے جنرل سکریٹری پرویز عالم نے مہمانوں کو گلدستہ پیش کیا اور ظفر مجیبی کو ان کی چالیس سالہ ادبی خدمات کے اعتراف میں شمشاد حسین صاحب اور وہاب اشرفی صاحب کے ہاتھوں شال پوشی کر کے توصیف نامہ اور مومنٹو سے نوازا۔ نسیم احمد نسیم نے ظفر مجیبی کی شاعرانہ شخصیت پر مختصر مگر جامع روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ ظفر مجیبی گرچہ کلاسیکی لب ولہجہ کے شاعر ہیں لیکن وہ عام روایتی شاعروں کے برعکس اپنے گرد وپیش اور عالمی منظرنامے پر گہری نظر رکھتے ہیں۔ ان کا پہلا شعری مجموعہ ''رموز دل'' 1999 اور دوسرا ''اقدار'' 2003 میں منظر عام پر آ کر داد وتحسین حاصل کر چکے ہیں۔ مہمان خصوصی جناب شفیع مشہدی نے کہا کہ چمپارن بہت ہی زرخیز جگہ ہے۔ ظفر مجیبی کا تعلق اسی تاریخی سرزمین سے ہے۔ ان کی شاعری سہل ممتنع کی خوبصورت مثال ہے۔ پروفیسر شمشاد حسین نے کہا کہ شاعری میں اصل چیز فنکاری ہے۔ ظفر مجیبی کے یہاں فن ہے۔ انکا اپنا الگ لب ولہجہ ہے جو انھیں دیگر شعرا سے ممیز کرتا ہے۔

جناب ظفر مجیبی نے علمی مجلس بہار اور عظیم آباد کے شعرا و ادبا حضرات کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا کہ آپ نے مجھے اعزاز سے نوازا اور چالیس سالہ ادبی خدمات کو سراہا۔ ظفر مجیبی نے کہا کہ ادب سماج کا آئینہ ہے۔ فنکار جو کچھ دیکھتا ہے محسوس کرتا ہے اسے شعری جامے میں ڈھال دیتا ہے۔ میری شاعری بھی اس سے مستثنیٰ نہیں ہے۔ ظفر مجیبی نے کہا کہ میں روایت، جدیدیت، مابعد جدیدیت کے پیچھے نہیں بھاگتا۔ میں احساس اور فن کو اولیت دیتا ہوں۔ صدر محفل پروفیسر وہاب اشرفی نے کہا کہ جنونی کیفیت کے بغیر فن کاری ناممکن ہے۔ انھوں نے کہا کہ شاعری ٹھنڈک کو آگ اور آگ کو ٹھنڈک بنانے کا فن ہے۔ انھوں نے کہا کہ ظفر مجیبی کی شاعری کلاسکیت اور رومانیت سے قطع نظر ان کی قلبی واردات کی عکاس ہے۔ ادیبوں کو زندگی کا ترجمان ہونا چاہیے۔ ظفر مجیبی کی شاعری اس کی بہترین مثال ہے۔ (ڈاک سے)

● احباب اردو اکادمی اور ماہنامہ قرطاس کے زیر اہتمام اسلامیہ ہائی اسکول و جونیئر کالج آف سائنس مومن پورہ ناگپور کے ہال میں جناب منظر

قدوسی کے سماجی و اصلاحی ناول ''اٹوٹ رشتہ'' کے اجرا کی رسم الحاج وکیل پرویز صاحب نے انجام دی۔ جناب مولانا امیرالدین ملک نے جلسے کی صدارت فرمائی۔ ڈاکٹر محمد شرف الدین ساحل اور ڈاکٹر آغا غیاث الدین صاحب نے اظہار خیال کیا۔ جلسے کے کنوینر جناب محمد امین الدین نے صدر جلسہ مہمانان خصوصی اور صاحب اعزاز جناب منظر قدوسی اور جناب محمد حشمت اللہ صاحب کی خدمات میں گل دستے پیش کیے اور ان کا استقبال کیا۔ اس کے بعد جناب ظفر کلیم کی صدارت میں مشاعرے کا آغاز ہوا۔ جن شعرا نے اپنے کلام سے سامعین کو محظوظ فرمایا۔ ان کے اسمائے گرامی یہ ہیں۔ جناب ظفر کلیم، جناب خضر ناگپوری، جناب منظر قدوسی، جناب محفوظ اثر، جناب اسحٰق اکمل، جناب ظہیر عالم، جناب مشتاق احسن، جناب نظیر نخشب، جناب رسول انور، جناب نعیم انصاری، جناب ریحان ناصر، سامعین کی داد و تحسین اور جناب کلیم احمد صاحب کی نظامت سے کامیاب مشاعرہ رات دو بجے اپنے اختتام کو پہنچا۔

(ڈاک سے)

مشاعرے

● جے پور۔ مرحوم راہی شہابی کی یاد میں 19 اپریل بروز سنیچر جے پور کے رام لیلا میدان میں ہند و پاک مشاعرے کا انعقاد کیا گیا۔ مشاعرے میں پاکستان کے ممتاز شاعر احمد فراز نے بھی شرکت کی۔ مشاعرے کی صدارت میئر جے پور نے کی اور مہمان خصوصی وزیر برائے تعلیم کالی چرن صراف تھے۔ مشاعرے کے مہمان ذی وقار برج کشور شرما ایم ایل اے تھے اور مہمان اعزازی مشہور جوہری نورتن کوٹھاری تھے۔

مشاعرے سے قبل راہی شہابی کی کتاب ''ایک لمحہ'' کا اجرا احمد فراز کے دست مبارک سے عمل میں آیا مشاعرے میں جن شعرائے کرام نے شرکت فرمائی ان کے اسمائے گرامی حسب ذیل ہیں۔ پاکستان: احمد فراز، ہندوستان: وسیم بریلوی، مخمور سعیدی، گلزار دہلوی، زبیر رضوی، معراج فیض آبادی، منظر بھوپالی، نسیم نکہت، نواز دیوبندی، نصرت مہدی، پاپولر میرٹھی، عقیل نعمانی، عبدالاحد ساز، ملکہ نسیم، ضیا ٹونکی، حنا تیموری، سہیل لکھنوی، انعام شرر ایوبی، رفیق ہاشمی، حسین انور، رضا شیدائی، زینت کیفی اور وپل چترویدی۔ نظامت کے فرائض منصور عثمانی نے ادا کیے۔ (ڈاک سے)

● علی گڑھ۔ 7 مئی، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے ویمنس کالج آڈیٹوریم میں سالانہ مشاعرہ منعقد ہوا جس میں برصغیر کے نامور شاعروں نے شرکت کی۔ مشاعرے کی صدارت پروفیسر سعید الظفر چغتائی نے کی، جب کہ نظامت کے فرائض ڈاکٹر سید سراج اجملی نے انجام دیے۔ استقبالیہ پروفیسر مسعود انور علوی نے پیش کیا۔ مشاعرے کی کنوینر پروفیسر ماریہ بلقیس تھیں جبکہ کوآرڈینیٹر ڈاکٹر احسان اللہ فہد تھے۔ جن شعرا نے کلام سنایا وہ یہ ہیں:

نواز دیوبندی، عالم خورشید، افضل منگلوری، عنبر بہرائچی، فرحت احساس، شہپر رسول، تابش مہدی، عبید صدیقی، مہتاب حیدر نقوی، سراج اجملی، راشد انور راشد، انجمن آرا انجم، نور جہاں ثروت، سلمیٰ شاہین، شارق کیفی، پرویز کاکوری، راشد حامدی، ضمیر اعظمی۔ (راشٹریہ سہارا، نئی دہلی)

● میرٹھ۔ 3 مئی، میرٹھ کے تاریخی میلہ نوچندی میں ہر سال کی طرح امسال بھی ایک کل ہند مشاعرہ بنام قومی یکجہتی پٹیل منڈپ میں منعقد کیا گیا۔ جس کی صدارت ڈاکٹر معراج الدین سابق وزیر آبپاشی یوپی اور نظامت معروف شاعر انور جلال پوری نے کی۔ بحیثیت مہمان خصوصی وزیر داخلہ برائے مملکت حکومت ہند ڈاکٹر شکیل احمد نے شرکت کی اور معروف فلمی اداکار فاروق شیخ نے شمع روشن کر کے مشاعرے کا آغاز کیا۔ مشاعرے میں سامعین کا عالم یہ تھا کہ مشاعرہ گاہ میں قدم رکھنے کی بھی جگہ نہیں تھی۔ مشاعرے کا آغاز نواز دیوبندی کی نعت پاک سے ہوا۔ پوری رات بحسن وخوبی مشاعرہ چلتا رہا۔ جن شعرا نے اس مشاعرے میں شرکت کی ان کے اسمائے گرامی ہیں: ابراہیم اشک، راحت اندوری، نزہت انجم، شبینہ ادیب، حق کانپوری، جوہر کانپوری، منظر بھوپالی، مظفر رزمی، اناد دہلوی، طاہر فراز مشاعرہ کمیٹی کے صدر ڈاکٹر معراج الدین اور کنوینر سلیم بھارتی نے سبھی کا شکریہ ادا کیا۔

● مظفر نگر۔ 2 مئی، زیر سرپرستی امیر عالم خاں ایم پی ایک کل ہند مشاعرہ منعقد ہوا۔ مشاعرے کی صدارت محمد ناصر ایڈوکیٹ نے کی اور نظامت کے فرائض انور جلال پوری نے انجام دیے۔ مہمان خصوصی کے طور پر عبدالقادر رانا نے شرکت کی۔ درج شعرا نے کلام سنایا۔ راحت اندوری، منظر بھوپالی، اقبال اشہر، پاپولر میرٹھی، انور جلال پوری، معراج فیض آبادی، شبینہ ادیب، نواز دیوبندی، خالد زاہد، اشوک ساحل، سکندر حیات گڑبڑ، محشر آفریدی اور مدن موہن دانش۔

● دھمری۔ 36 گڑھ مقیم بھارتی جو اردو وہندی دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے ان کی یاد میں ہر سال ایک مشاعرے کا اہتمام کیا جاتا ہے۔ جس میں قومی سلسلے کے شاعروں کو بھی مدعو کیا جاتا ہے۔ یہ اردو کا واحد پروگرام اس شہر میں ہوتا ہے اس کا انعقاد مرحوم کے ایک قریبی دوست دھرو دھر دیوان کرتے ہیں۔ وہ روزانہ مقیم بھارتی کی آمد پر پھول چڑھاتے ہیں اور ان کا بھجن گاتے ہیں۔ امسال یہ مشاعرہ 2 اپریل کو منعقد کیا گیا جس کی صدارت

ڈاکٹر نرنجن مہاور نے کی اور اس میں جبلپور، ناگپور، دموہ، دھولیہ، واگ بھلائی سے آئے ہوئے شعرا شریک ہوئے۔ (ڈاک سے)

وفیات

نرملا دیش پانڈے

● مشہور گاندھیائی لیڈر نرملا دیش پانڈے کا 3 اپریل کو رات دو بجے انتقال ہوگیا۔ ان کی عمر 79 سال تھی۔ وہ بڑے مضبوط عزم اور حوصلے کی خاتون تھیں۔ سیکولرزم اور جمہوریت پر ان کا ایمان نہایت مضبوط تھا۔ وہ اپنے ملک اور پوری دنیا میں پیش آنے والے پرتشدد واقعات کو انسانی نظریے سے دیکھتی تھیں۔ انھوں نے نہ صرف انتہا پسندی سے نبرد آزما جموں وکشمیر میں امن کی شمع روشن کرنے کی کوشش کی بلکہ وہ پنجاب کی خالصتان تحریک کے عروج کے زمانہ میں بھی گولیوں کی پروا کیے بغیر جابجا پہنچیں۔ انھوں نے امن کے فروغ کے لیے پاکستان کا بھی دورہ کیا اور گاندھیائی فلسفہ عدم تشدد کو عام کرنے کے لیے دنیا کے دیگر ممالک بھی گئیں۔

نرملا دیش پانڈے کی زندگی پر ونوبا بھاوے نے ان مٹ نقوش چھوڑے۔ یہ نرملا کے عنفوان شباب کا وقت تھا۔ وہ ناگپور یونیورسٹی سے سیاست میں ماسٹر کی ڈگری حاصل کرنے کے بعد کالج میں لیکچرر کے طور پر خدمات انجام دے رہی تھیں لیکن انھوں نے ونوبا بھاوے کی بھودان تحریک کے لیے سب کچھ چھوڑ دیا اور ونوبا بھاوے کے ساتھ ملک بھر میں 40ہزار کلومیٹر پیدل یاترا کی۔ جس سے انھیں دیہی ہندوستان کے مسائل کو سمجھنے کا موقع ملا۔ اس طرح انھوں نے گاندھی جی کے گرام سوراج کے لیے خود کو پوری طرح وقف کردیا۔ نرملا دیش پانڈے تشدد اور فرقہ پرستی کے خلاف سیسہ پلائی ہوئی دیوار کی طرح تھیں۔ گجرات کے بھیانک مسلم کش فسادات پر وہ کانپ اٹھیں۔ انھوں نے فرقہ وارانہ فسادات کے نتیجے میں پھیلی نفرت اور بے اعتمادی کو دور کرنے کے لیے فنکاروں اور قلم کاروں کے تعاون سے ''ساجھی وراثت'' کے نام سے فورم تیار کیا۔ انھوں نے ملک کی مشترکہ تہذیبی روایت کو برقرار رکھنے کے لیے ہر ممکن کوشش کی۔ انھوں نے گجرات کے عوام کو اپنے اندر جھانک کر مردہ ہورہی انسانیت کو بچانے کے لیے ''ادھیاتما جاگرن منچ'' کا بھی اہتمام کیا۔ محترمہ دیش پانڈے کی پیدائش 17 اکتوبر 1929 کو مہاراشٹر کے شہر ناگپور میں پی وائی دیش پانڈے اور رولا مائی دیش پانڈے کے گھر میں ہوئی تھی۔ انھوں نے سیاست میں ایم اے کیا تھا۔ پنجاب کی پٹیالہ یونیورسٹی، مہاراشٹر کی امراوتی یونیورسٹی اور کاشی ودیاپیٹھ نے انھیں ڈاکٹریٹ کی اعزازی ڈگریاں دی تھیں۔ ''دیدی'' کے نام سے مشہور محترمہ دیش پانڈے 1952 میں ونوبا بھاوے کی بھودان تحریک میں شامل ہوگئی تھیں۔ انھیں 2006 میں ملک کا سب سے بڑا غیر فوجی اعزاز پدم وبھوشن دیا گیا تھا، انھوں نے کئی کتابیں لکھیں جن میں ''ونوبا کے ساتھ''، ''کرانتی کی راہ پر''، ''سیمانت''، ''ونوبا'' جیسی کتابیں شامل ہیں۔ ان کے ایک ناول ''چنگ لنگ'' کو صدارتی انعام بھی ملا تھا۔ انھوں نے مختلف وفود کے رکن کی حیثیت سے 3 بار سابق سوویت یونین کا دورہ کیا۔ روس کے صدر ولادیمیر پتن نے 26 جنوری 2007 کو نئی دہلی میں واقع روسی سفارت خانے میں منعقد ایک خصوصی تقریب میں انھیں ''آرڈر آف فرینڈ شپ'' اعزاز دیا۔ انھیں دوبار راجیہ سبھا کے لیے نامزد کیا گیا۔

مولانا سید انظر شاہ کشمیری

● 26 اپریل بلند پایہ خطیب اور معروف عالم دین مولانا سید انظر شاہ کشمیری کا آج صبح دہلی کے سرگنگا رام اسپتال میں انتقال ہوگیا۔ وہ 82 سال کے تھے۔ کنبے کے ذرائع کے مطابق مولانا نے صبح تقریباً 10:20 بجے داعی اجل کو لبیک کہا، مرحوم گزشتہ کچھ برسوں سے جگر اور گردے کی بیماری میں مبتلا تھے۔ عالم اسلام کی معروف شخصیت حضرت علامہ انور شاہ کشمیری کے آپ سب سے چھوٹے صاحبزادے تھے، گزشتہ 55 سال سے تفسیر و حدیث کا درس دارالعلوم دیوبند اور اس کے بعد دارالعلوم وقف میں دے رہے تھے، وہ 30 سال سے مسلسل بخاری شریف کا درس بھی دے رہے تھے، پسماندگان میں اہلیہ کے علاوہ 6 بیٹیاں اور ایک بیٹا مولانا احمد خضر شاہ ہیں۔ انھوں نے دیوبند میں ہی جامعہ انور کے نام سے ایک تعلیمی ادارہ قائم کرکے اپنی محنت اور کوششوں سے اسے بلند مقام تک پہنچایا۔ مولانا انظر شاہ نے اپنی ابتدائی تعلیم اپنے دور کے نامور علمائے دین مولانا قاری محمد طیبؒ اور مولانا حسین احمد مدنیؒ کے علاوہ اپنے والد بزرگ علامہ انور شاہ کشمیریؒ سے حاصل کی تھی۔ اپنی بصیرت اور اسلامی علوم پر عبور کی وجہ سے انھوں نے نہ صرف ہندوستان بلکہ عرب اور یوروپی ممالک میں بھی اپنا نام روشن کیا، ساری دنیا میں ان کے معتقدین ہیں، انھوں نے بہت سے بیرونی ممالک کا سفر کیا اور کئی اہم اسلامی کانفرنسوں میں شرکت کی۔ مذہبی خدمات کے علاوہ مولانا انظر شاہ نے فرقہ پرست طاقتوں کے خلاف لڑنے کے لیے سیاست میں بھی حصہ لیا، وہ اترپردیش کانگریس کے نائب صدر کے عہدے پر فائز کیے گئے انھوں نے کانگریس سے اختلاف سے بھی گریز نہیں کیا۔ اقلیتی مسائل پر ان کی گہری نظر کی وجہ سے مولانا کو اقلیتی امور سے متعلق کمیٹی میں بھی نائب صدر کے عہدے پر نامزد کیا گیا اے آئی سی سی کی ایگزیکیٹو کے مدعوین خصوصی میں بھی شامل

تھے۔ مولانا تنظیم علمائے ہند کے بانی وصدر تھے۔ ان کے انتقال کی خبر سے علمی، دینی، سیاسی حلقوں میں صف ماتم بچھ گئی۔ مرحوم موجودہ اکابر دیوبند میں سرفہرست تھے۔ ہزاروں سوگواروں اور سرکردہ شخصیات کی موجودگی میں بعد نماز عشا دارالعلوم دیوبند کے احاطہ مولسری میں نماز جنازہ ادا کی گئی اور مرحوم کو مزار انوری میں والد محترم کے پہلو میں سپرد خاک کردیا گیا۔ درجنوں کتابوں کے مصنف مولانا مرحوم نے ہزاروں شاگردوں کی تربیت کی جو ملک اور بیرون ملک دین کی خدمات انجام دینے میں مصروف ہیں۔

زبیر شفائی

● جدید لب ولہجے کے معروف شاعر زبیر شفائی بھی داغ مفارقت دے گئے۔ زبیر شفائی آزادی سے صرف تین سال پہلے یعنی 1944 میں پیدا ہوئے اس لحاظ سے 27 فروری 2008 کو ان کی عمر صرف 64 سال تھی لیکن اس قلیل عرصے میں مرحوم نے جدید شاعری میں اپنی ایک اہم حیثیت قائم کر لی تھی نہایت مخلص انسان اور سادہ شخصیت کے مالک زبیر شفائی اردو دنیا میں تعارف کے محتاج نہیں تھے۔ ان کی کمی یوں بھی محسوس ہوگی کہ ہمعصر شعرا میں ان کے قد کی برابری کرنے والے گنتی کے چند شاعر ہیں۔ ان کی شاعری میں جہاں اندرونِ ذات کی جلوہ فرمائی نظر آتی ہے وہیں سماج میں پھیل رہی بدعنوانیوں کو بھی انھوں نے اپنا موضوع بنایا۔ جدید غزل کے حوالے سے زبیر شفائی کو ہمیشہ یاد کیا جاتا رہے گا۔

پروفیسر مسعود احمد

● نئی دہلی۔ 29 اپریل، برصغیر کے ممتاز محقق پروفیسر مسعود احمد کل رات کراچی میں چل بسے وہ 78 برس کے تھے۔ تدفین آج بعد نماز ظہر کراچی میں عمل میں آئی۔ مرحوم دہلی کی فتح پوری مسجد کے امام ڈاکٹر محمد مکرم احمد کے حقیقی چچا تھے۔ مرحوم کے پسماندگان میں اہلیہ، ایک بیٹا اور تین بیٹیاں ہیں۔ پروفیسر مسعود احمد نے ابتدائی تعلیم مدرسہ عالیہ فتح پوری میں حاصل کی۔ وہ اپنے بڑے بھائی مولانا منظور احمد کی تیمارداری کے سلسلے میں 1948 میں پاکستان گئے اور پھر وہیں کے ہو رہے۔ پاکستان میں اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے بعد وہ متعدد تعلیمی اداروں سے وابستہ رہے۔ 200 سے زائد کتابوں کے مصنف پروفیسر مسعود احمد نے خاندان مظہریہ پر متعدد کتابیں لکھیں اس کے علاوہ حضرت مجدد الف ثانی پر 14 جلدوں پر مشتمل کتاب لکھی جسے حضرت مجدد الف ثانی کا انسائیکلوپیڈیا کہا جاتا ہے۔

محمود ذکی

● اجین۔ 3 مئی، معروف شاعر، ادیب اور صحافی محمود ذکی کا علی الصباح انتقال ہوگیا۔ وہ 84 سال کے تھے۔ 7 دسمبر 1924 کو اجین میں پیدا ہونے والے محمود ذکی نے ہندوستان کے معروف اخبارات اور رسالوں میں اپنے مضامین کا جادو بکھیرا، جن میں قومی آواز، دنیا، پیام وطن، انقلاب، سفیر مالو پیغام، اردو ٹائمز، افکار وغیرہ شامل ہیں۔ وہ کچھ دنوں سے اندور کے اسپتال میں داخل تھے۔ محمود ذکی کو اردو میں کالی داس پر کام کے لیے یاد رکھا جائے گا، وہ امتیاز میر (لکھنؤ) ایوارڈ سے 1994 میں نوازے گئے، اجین میں 1996 میں بالی ناتھ سمان سے بھی انھیں نوازا گیا۔ شمشیر بہادر سمان 2000 میں ملا تھا۔

مظہر حسینی

● نئی دہلی۔ 30 اپریل، بزرگ اردو صحافی اور آل انڈیا ریڈیو کے سابق اردو نیوز ریڈر مظہر حسینی کا کل یہاں طویل علالت کے بعد انتقال ہوگیا۔ وہ 79 برس کے تھے۔ تدفین دلشاد گارڈن قبرستان میں عمل میں آئی۔ پسماندگان میں اہلیہ کے علاوہ دو بیٹیاں اور چار بیٹے ہیں۔ مظہر حسینی 1960 کی دہائی میں ریڈیو سے وابستہ ہوئے اور تقریباً اکیس سال نیوز سروس ڈویژن کی اردو یونٹ سے وابستہ رہے۔ 1985 میں وہ اردو یونٹ کے سربراہ کی حیثیت سے رٹائر ہوئے۔

□□□

بچوں کی صلاحیتیں ان کی مادری زبان سے ابھرتی ھیں۔
گھروں میں بھتر اردو تعلیم کا انتظام کیجیے۔
اردو کی نئی نسل کو تیار کرنا ھم سب کا فرضِ اولیں ھے۔

آئینۂ جہاں (کلیات قرۃ العین حیدر)

''آئینۂ جہاں'' جلد اوّل

قرۃ العین حیدر نے قدیم و جدید ہندوستانی تہذیب کو جس خوبصورتی اور فن کارانہ مہارت کے ساتھ اپنی تحریروں میں سمویا ہے وہ انھی کا حصہ ہے۔ کلیات کی اس پہلی جلد میں 35 افسانے شامل ہیں جو گذشتہ ساٹھ ستر سال کے تیزی سے بدلتے ہوئے سماجی منظرنامے کی جھلکیاں پیش کرتے ہیں۔ یہ افسانے اس وقت لکھے گئے جب مصنفہ کا تعلیمی سلسلہ جاری تھا اور ان کے بقول اس مجموعے کے کئی افسانے یونیورسٹی کے افسانوی ماحول سے تعلق رکھتے ہیں۔

صفحات — 600، قیمت — 266 روپے

''آئینۂ جہاں'' جلد دوم

''آئینۂ جہاں'' جلد دوم میں 32 افسانے شامل ہیں جن میں ''فقیروں کی پہاڑی''، ''فوٹوگرافر''، ''روشنی کی رفتار''، ''یہ غازی یہ تیرے پراسرار بندے'' اور ''آوارہ گرد'' جیسے افسانے بھی ہیں جو اردو افسانے کے سخت سے سخت انتخاب میں شامل کیے جاسکتے ہیں تو دوسری طرف ''دکھلایئے لے جاکے تجھے مصر کا بازار'' اور ''میں بوری ڈوبت ڈوری'' جیسے افسانے بھی ہیں جن سے قرۃ العین حیدر کے ذہنی ارتقا کا اندازہ ہوتا ہے۔

صفحات — 612، قیمت — 270 روپے

''آئینۂ جہاں'' جلد سوم

''آئینۂ جہاں'' کی اس تیسری جلد میں قرۃ العین حیدر کے پانچ ناولٹ — ''سیتاہرن''، ''چائے کے باغ''، ''ہاؤسنگ سوسائٹی''، ''اگلے جنم موہے بٹیا نہ کیجو'' اور ''دل ربا'' تاریخی ترتیب سے شامل ہیں۔ قرۃ العین حیدر نے اپنے پورے فکشن بشمول ناولٹ میں اپنے تجربات و مشاہدات کو مختلف خواتین کے کردار میں پیش کیا ہے جو زندگی میں ہر قدم پر مصالحت کرتی آرہی تھیں لیکن آج اصولوں کی خاطر جان کی بازی لگانے پر آمادہ ہیں۔ پیانو، پکھراج اور گٹار بجانے والی، روشنی کی رفتار سے پرواز کرنے والی اب ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں کی متلاشی ہے۔

صفحات — 502، قیمت — 230 روپے

''آئینۂ جہاں'' جلد چہارم

وقت اور تہذیب کی قلابازیوں کی حسین تفسیر بیان کرنے میں قرۃ العین حیدر کو مہارت کاملہ حاصل ہے۔ عہد ایسٹ انڈیا کمپنی سے ہندوستان میں جس دورنگی معاشرت کی نمود ہوئی اور اس وقت سے لے کر اب تک ہندوستان کی گنگا جمنی تہذیب جن نشیب و فراز سے دوچار ہوئی ان کی جھلکیاں جلد چہارم کے افسانوں میں دکھائی دیتی ہیں۔ اس جلد میں قرۃ العین حیدر کے ایسے اکیس افسانے شامل ہیں جو اب تک ان کے کسی مجموعے میں شامل نہیں ہوئے تھے۔ اس میں ان کا وہ اوّلین افسانہ بھی ہے جو ''ایک شام'' کے عنوان سے ''ادیب'' نومبر 1943 میں ''لالہ رخ'' کے فرضی نام سے شائع ہوا تھا۔

صفحات — 758، قیمت — 384 روپے

● چاروں جلدوں کے مرتب جمیل اختر ہیں جنھوں نے مصنفہ کی نگرانی میں یہ اہم کام انجام دیا ہے۔

نوٹ: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دھلی کی جانب سے طلبہ اور اساتذہ کے لیے بالترتیب 45% اور 40% کی خصوصی رعایت دی جاتی ھے۔ تاجران کتب کو قومی اردو کونسل کے ضوابط کے مطابق رعایت دستیاب ھے۔

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک-8، ونگ-7، آر. کے. پورم، نئی دلی-110066

تبصرہ وتعارف

● **جامع التذکرہ (دوجلدیں)**

مصنف: پروفیسر محمد انصاراللہ

صفحات: 1063، **قیمت:** 395 روپے (دونوں جلدیں)

ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک۔ 1، آر۔ کے۔ پورم، نئی دہلی۔ 66

مبصر: عمیر منظر، G/5A، ابوالفضل انکلیو، اوکھلا، نئی دہلی۔ 110025

''جامع التذکرہ'' جیسا کہ نام سے ہی ظاہر ہے ان تذکروں کا مجموعہ ہے جن میں شعرائے اردو کے حالات ان کے انتخاب اشعار کے ساتھ موجود ہیں۔ مگر اس کتاب میں مولف نے اشعار کے انتخاب کو شامل نہیں کیا ہے بلکہ اس میں صرف شعرائے اردو کے حالات زندگی درج کیے گئے ہیں۔ اس طرح کہ پہلے شاعر کا نام، پھر اس کے بارے میں تذکروں سے ماخوذ اس کے حالات۔ مولف نے ''جامع التذکرہ'' کو دو جلدوں میں منقسم کیا ہے۔ پہلی جلد میں ابتدا (پہلے تذکرے) سے 1800 / 1215ھ تک کے وہ تذکرے شامل ہیں جن کو محمد شاہی عہد میں تالیف کیا گیا ہے۔ انصار اللہ صاحب نے اس بات کا بھی اہتمام کیا ہے کہ دونوں جلدوں میں موجود شعرا کو تین حصوں میں تقسیم کر دیا جائے۔ پہلا حصہ متقدمین کا ہے دوسرا متوسطین کا اور تیسرا متاخرین کا۔ پہلی جلد میں ان حصوں کو یوں ترتیب دیا گیا ہے۔

1- متقدمین: وہ شعرا جو محمد شاہ بادشاہ کے عہد 1161ھ/ 1748 تک رہے۔
2- متوسطین: محمد شاہ کے بعد سے 1215ھ/1800 تک کے شعرا
3- متاخرین: 1215ھ/ 1800 کی نسل کے شعرا

اسی طرح دوسری جلد میں ان تذکروں کو جمع کیا گیا ہے جو کہ عالمگیر ثانی کے عہد میں تالیف ہوئے۔ اس جلد میں بھی تین حصوں کی تقسیم یوں کی گئی ہے۔

1- متقدمین: عالمگیر ثانی کے دور تک کے شعرا
2- متوسطین: شاہ عالم ثانی کے دور تک کے شعرا
3- متاخرین: اکبر شاہ ثانی کے زمانے کے شاعر

اس میں کوئی شک نہیں کہ مولف نے ان تذکروں کو بہت محنت سے جمع کیا ہے۔ ہر جلد کے آخر میں تکملے کے طور پر ان شعرا کو بھی شمار کیا گیا ہے جن کے بارے میں ہمارے سامنے موجود تذکرے کچھ زیادہ معلومات فراہم نہیں کرتے۔ ''جامع التذکرہ'' کی افادیت یہ ہے کہ اس کی وجہ سے اوّل تو ہمیں ہر شاعر کے عہد کے بارے میں یقینی معلومات مل جائیں گی دوسرے یہ ہمیں ہر شاعر کے حالات زندگی کے بارے میں موجود ہر چھوٹی بڑی بات جاننے کا موقع فراہم کرتا ہے۔ آج کل کے مصروف ترین دور میں کسی شخص کے پاس اتنا وقت نہیں ہے کہ وہ کسی شاعر کے بارے میں کچھ جاننے کے لیے تذکروں کی تلاش کرتا پھرے ایسے میں ''جامع التذکرہ'' شعرا کے بارے میں جاننے کا شوق اور خواہش رکھنے والوں کے لیے کسی نعمت سے کم نہیں ہے۔ اس کتاب کی سب سے اہم افادیت یہ ہے کہ اسے پڑھ کر ہم مولفین کے تنقیدی اور تحقیقی رویوں کا بخوبی اندازہ لگا سکتے ہیں۔ ایک ہی وقت میں لکھے گئے تذکروں میں موجود اختلافات اور اتفاقات کے بارے میں زیادہ سے زیادہ جان سکتے ہیں۔

مولف نے دونوں جلدوں کی شروعات میں مقدمہ بھی تحریر کیا ہے جس کو پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ اس نوعیت کا کام کتنی سخت محنت اور صبر کا مطالبہ کرتا ہے۔ تمام اہم اور غیر اہم تذکرے جمع کرنے کے لیے ان کے حصول اور استناد کا مسئلہ درپیش ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ ہر تذکرے سے ہر شاعر کے بارے میں وہ حصہ اخذ کرنے کے لیے جو دوسرے تذکروں سے منفرد ہو، باریک بینی سے کام لینا ضروری ہے۔ ''جامع التذکرہ'' کی تالیف سے مصنف کا اصل مقصد یہ ہے کہ وہ تذکروں کے مطالعے کا شوق ایک دفعہ پھر سے اردو قاری کے دل میں پیدا کر سکیں اور اس راہ میں حائل رکاوٹوں کو دور کر سکیں۔ اس کا ذکر انھوں نے خود پہلی جلد کے مقدمے میں کیا ہے وہ لکھتے ہیں کہ:

''آج اردو کی کتابوں کا دستیاب ہونا خود ایک مسئلہ بن گیا ہے۔ تذکرے تو اور بھی کمیاب ہیں۔ پھر ستم بالائے ستم یہ ہے کہ بیشتر فارسی میں لکھے گئے ہیں جس کا چلن ہمارے یہاں کم سے کم ہے۔ نئی نسل کے لیے تذکروں تک رسائی حاصل کرنا، پڑھنا اور سمجھنا کارے دارد کے مصداق ہے۔ ایک مشکل یہ ہے کہ ایک شاعر کے حالات کتنے اور کن کن تذکروں میں مندرج ہیں۔ اس کا سراغ کس طرح ملے؟ غرض مختلف اور متعدد وجوہ سے تذکروں کے مطالعے کا شوق کم سے کم ہوتا جارہا ہے۔''

(''جامع التذکرہ'' جلد اوّل صفحہ 19)

''جامع التذکرہ'' کو پڑھ کر نہ صرف شاعروں کی نجی زندگی کے بارے میں معلومات حاصل ہوتی ہیں بلکہ ان کے عہد کے تہذیبی، تاریخی اور تعلیمی پس منظر سے بھی آگاہی ہوتی ہے۔ مولف نے جیسا کہ اوپر مذکور ہوا ہے فارسی تذکروں میں موجود معلومات کو اردو میں ترجمہ کرکے پیش کیا ہے جس سے فارسی نہ جاننے والوں کے لیے بہت آسانی ہوگئی ہے۔ ترجمہ نہایت سلیس اور رواں ہے۔ کم سے کم جملوں میں زیادہ سے زیادہ معلومات فراہم کرنے کی

کوشش کی گئی ہے۔ مولف نے مقدمے میں ان تذکروں کا ذکر تو کیا ہی ہے جن سے اس نے اپنی تالیف میں مدد لی ہے مگر ان تذکروں کا بھی ذکر کردیا گیا ہے جو کافی محنت کے بعد بھی مولف کو حاصل نہ ہوسکے۔

انصار اللہ صاحب نے ایسے دور میں جہاں تذکروں سے اردو والوں کی دلچسپی کم ہوتی جارہی ہے،'' جامع التذکرہ'' تالیف کرکے ایک اہم کوشش کی ہے جو داد طلب ہے۔

● مرزا محمد رفیع سودا

مصنف: خلیق انجم

صفحات: 673، **قیمت:** 173روپے

ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک-1، آر. کے. پورم، نئی دہلی-66

مبصر: مشکور معینی، 224، پیریار ہاسٹل، جواہر لعل نہرو یونیورسٹی، نئی دہلی-67

خلیق انجم نے اس کتاب میں مرزا محمد رفیع سودا کی شخصیت، شاعری اور ان کے عہد کی سماجی و سیاسی صورتِ حال کا تحقیقی جائزہ پیش کیا ہے۔ سودا کی شخصیت، شاعری اور ان کے عہد کا اتنا تفصیلی ذکر اس کتاب کے سوا کہیں نہیں ملتا۔ اگر چہ اس سے قبل شیخ چاند کی کتاب'' سودا'' 1936 میں شائع ہو چکی ہے مگر زیرِ نظر کتاب زیادہ جامع اور پُر از معلومات ہے۔ سودا پر جو کام ہوا ہے وہ زیادہ تر یک رخی نوعیت کا ہے سودا کے قصیدوں کو زیادہ اہمیت دی گئی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ سودا کی غزل یا ان کی دوسری اصناف پر خاطر خواہ توجہ نہیں کی گئی۔ خلیق انجم نے اس یک رخے انداز نظر کو رد کیا ہے۔

ہماری تحقیق نے انیسویں صدی کے نصف اول میں اردو کے تین اہم شعرا میر، درد اور سودا کو اجاگر کیا۔ ان تینوں شعرا نے اردو شاعری کی آبیاری میں حصہ لیا اور اسے فکروفن کی نئی بلندیوں تک پہنچایا۔ میر نے سوز وگداز تو درد نے متصوفانہ کیفیات کو اپنی شاعری کا محور بنایا سودا نے اپنے دونوں ہم عصروں کے برعکس ظرافت وشوخی کو بھی اپنی شاعری میں جگہ دی۔ دراصل سوز وگداز، تصوف اور ظرافت وشوخی مل کر انسانی زندگی کی مکمل تصویر پیش کرتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ سودا کی شاعری کا مطالعہ کیے بغیر میر اور درد کے عہد اور اس عہد کے سیاسی وسماجی پس منظر کو نہیں سمجھا جاسکتا۔

اردو کے تمام تذکرہ نگاروں اور نقادوں نے سودا کو بڑا شاعر تسلیم کیا ہے۔ مگر ان کی بڑائی کی بنیاد زیادہ تر ان کے قصیدوں پر قائم کی ہے۔ غزل یا دوسری اصناف پر کم۔ سودا کے کلیات میں قصیدوں کے علاوہ غزلیں، مثنویاں، مرثیے، رباعیاں، قطعے، پہیلیاں، شہر آشوب، ہجو، واسوخت سبھی کچھ موجود ہے اور ان تمام اصناف کے مطالعے سے ہی سودا کی ہمہ گیری کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ اردو غزل سودا کی مرہونِ منت ہے جنھوں نے اپنے زور بیان اور نشاط آمیز لب ولہجے کے وسیلے سے غزل کو مالا مال کیا۔ اس نکتے پر خلیق انجم نے تفصیلی گفتگو کی ہے۔

جب بھی قصیدے کا ذکر ہو تو پہلا نام سودا کا آتا ہے۔ سودا کے بغیر قصیدے کا تصور ممکن نہیں۔ اردو شاعری میں قصیدے کا آغاز بھی سودا نے کیا اور اسے عروج پر بھی انھی نے پہنچایا۔ سودا نے شاعری میں اپنے زمانے کے دکھ درد کا اظہار زندہ دلی کے لہجے میں کیا ہے۔ واردات قلبی اور انسانی جذبات و احساسات کو وہ پرشکوہ الفاظ، خیال انگیز استعاروں اور تشبیہوں کا جامہ پہناتے ہیں اور اپنی قادر الکلامی کا ثبوت دیتے ہیں۔ خلیق انجم نے سودا کی تمام شعری اصناف پر بحث کی ہے جو سودا کی شخصیت اور شاعری کو سمجھنے میں معاون ہوگی۔

● جتنے پاس اتنے دور

مصنف: دھیریندر سنگھ جفا

صفحات: 270، **قیمت:** 145روپے

ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک-1، آر. کے. پورم، نئی دہلی-66

مبصر: احمد کفیل، 29 اولڈ، برہم پتر ہاسٹل، جے این یو، نئی دہلی-110067

'' جتنے پاس اتنے دور'' انڈین فائٹر پائلٹ کی آپ بیتی ہے جو ناول کے اسلوب میں لکھی گئی ہے۔ دھیریندر سنگھ جفا نے پہلے اسے انگریزی میں "Three Countries: one people-Tales from to wars" کے نام سے لکھی تھی۔ کتاب بیسویں صدی کے آخر میں شائع ہوئی تھی۔ بعد میں اس کتاب کا بنگلہ میں ترجمہ ڈی. گھا نے کیا۔ پھر ہندی ترجمہ خود مصنف نے اپنے دوست سید مزمل فدا کے تعاون سے کیا اور اب اردو ترجمہ جناب شاہد جمال نے کیا ہے جسے قومی اردو کونسل نے حال ہی میں شائع کیا ہے۔

فائٹر پائلٹ جناب دھیریندر سنگھ جفا نے اپنی اس آپ بیتی میں دسمبر 1970 سے نومبر 1972 تک ہندوستان پاکستان اور بنگلہ دیش کی جنگوں کے توسط سے تقسیم شدہ ہندوستان کے ٹوٹے بکھرے دلوں کی آہوں اور کراہوں کو بڑی صفائی اور صدق دلی سے بیان کیا ہے۔ اس آپ بیتی کا مرکزی کردار وکرم ہے اور دوسرے کردار وکی، سندھو، گیری، ہیری اور ملند ہیں جو اپنے ملک کی شان وشوکت اور عظمت کے لیے پڑوسی ملک پاکستان کی فوجوں سے جنگ کرتے ہوئے دشمن ملک کی سرحد میں جا گھستے ہیں جہاں دشمن کی فوج انھیں قید کرلیتی ہے۔ پڑوسی ملک سے جنگ کی ابتدا، اس وقت کی سیاسی وسماجی صورت حال اور دونوں ملکوں کی فوجوں کے تیور اور انسانی ہمدردی کی تمام صورتوں کی عکاسی اس آپ بیتی میں کی گئی ہے۔

ایک فوجی پائلٹ جس کی لغت میں کیا، کیوں اور کیسے جیسے الفاظ کی کوئی گنجائش نہیں ہوتی اور جس کی آنکھوں پر صرف اور صرف فرائض کا چشمہ چڑھا

ہوتا ہے جسے صرف مقصد اور نصب العین دکھائی دیتا ہے۔ وہ بلندیوں پر اڑتے جہاز میں صرف الکٹرانک ڈسپلے دیکھ کر ہی نشانہ لگاتا ہے۔ جہاز سے نکلتے راکٹ اور گولیوں کی رفتار، دھماکے اور بارودی دھواں، دشمن کے چہرے کا خوف، زخمی جسم کی لاچاری اور تکلیف اور یہاں تک کہ خود اس کا وجود کب ختم ہوجائے اس کی بھی اسے خبر نہیں ہوتی۔ وہی جب انسانیت کے روبرو ہوتا ہے تو اس کا کلیجہ دہل اٹھتا ہے اور وہ سوچنے لگتا ہے کہ جب تک کوئی پنڈت، مولوی یا سیاسی بازی گر بیچ میں نہ آجائے ہندوستانیوں اور پاکستانیوں کے درمیان اور ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان ماحول کتنا خوشگوار ہوتا ہے۔ ''جتنے پاس اتنے دور'' میں دھیریندر سنگھ جفا نے اسی حقیقی کشمکش کو اپنے مشاہدات کی روشنی میں بیان کیا ہے۔

''جتنے پاس اتنے دور'' میں انڈین فائٹر پائلٹ کی آپ بیتی بیس الگ الگ عنوانات کے تحت بیان کی گئی ہے۔ عنوانات میں (1) موت تکلیف دہ نہ تھی، (2) ہمدردی اور بے رحمی، (3) رازداری اور جاسوسی، (4) اسپتال اور علاج، (5) کچھ غلط فہمیاں کچھ خوش فہمیاں، (6) اپنے لوگ اپنے ساتھی، (7) ایک امریکی مہمان، (8) کچھ ہنسی کچھ مذاق، (9) ہمت اور بزدلی، (10) دلیری اور شیطانی، (11) کالا سندھو، (12) وہ وقت ہی خراب تھا، (13) پنجڑے میں بند شیر، (14) آزادی کی پکار، (15) تیاریاں اور اندیشے، (16) کوچ، (17) ردِعمل، (18) باپ کی کمائی، (19) عائشہ اور (20) وطن واپسی، ہیں۔ آغاز میں کتاب کی اہمیت وافادیت پر ڈائرکٹر قومی اردو کونسل کا پیش لفظ دو صفحات، مصنف کی عرضِ داشت'' دولفظ'' اور مترجم شاہد جمال کا اعتراف'' کچھ مجھ سے بھی'' ایک ایک صفحات پر مشتمل ہے۔

کتاب ''موت تکلیف دہ نہ تھی'' سے شروع ہوتی ہے جس میں دسمبر 1970 میں مشرقی پاکستان میں پاکستان کے فوجی حکمراں جنرل یحییٰ خاں کے دور اقتدار میں انتخابی ہنگامے، 1971 کے'' کریک ڈاؤن'' کی یلغار، فوج کا عوام پر ظلم، امن کے لیے وزیر اعظم ہند اندرا گاندھی کی پیش قدمی اور اس کے نتیجے میں ہندوپاک کی جنگ کے واقعات بیان کیے گئے ہیں۔ ''ہمدردی اور بے توجہی'' میں اس آپ بیتی کے مرکزی کردار کا جنگ کرتے ہوئے پاکستان سرحد میں جا پھنسنا اور وہاں کی فوج کا ان کے ساتھ برتاؤ پیش کیا ہے۔ تیسرے حصے میں وکرم کا جاسوسی کے جرم میں دشمن کی فوجوں کی زد میں آجانا اور اس کا کرب واذیت سے گزرنا بیان کیا گیا ہے۔ چوتھے باب ''اسپتال اور علاج'' میں وکرم کے لاہور سے بیس کلومیٹر دور جہاز سے گزرنے، دشمن فوج کی حراست میں آنے اور لاہور اور پھر راولپنڈی کے ہسپتال میں زیر علاج رہنے کا واقعہ بیان کیا گیا ہے جہاں شفقت اور ہیبت دونوں رویوں سے اس کا سامنا ہوتا ہے۔ ''کچھ غلط فہمیاں اور کچھ خوش فہمیاں'' میں ہندوپاک کی فوجوں اور عوام کے درمیان ایک دوسرے کے تئیں انسانی رویوں اور اندرونی حقیقی سوچ سے پردہ ہٹانے کی کوشش کی گئی ہے۔ ''اپنے لوگ اپنے ساتھی'' میں لاہور جیل میں ہندوستانی فوجیوں کی آپسی ملاقات اور مشرقی پاکستان کی شکست پر تبادلۂ خیال دکھایا گیا ہے۔ ''ایک امریکی مہمان'' میں امریکی کرنل اگر جو'' ایکس ٹو'' طیارے کا موجد ہے، اس کی شاطرانہ حرکتوں اور ہندوپاک کے درمیان نازیبا حرکتوں کا پردہ فاش کیا ہے۔ '' کچھ ہنسی کچھ مذاق'' میں دونوں ملکوں کے فوجیوں کی آپسی بے تکلفی، اور حکمرانوں کی سیاسی وسماجی پالیسی کی کمزوریوں کا تمسخرانہ تجزیہ ہے۔ ''ہمت اور بزدلی'' میں ایئر پائلٹ کی سوچ اپنے گھر، خاندان اور دوستوں کی مدد اور ان کی پست ہمتی کا ذکر ہے۔ '' کالا سندھو'' اور'' دلیری و شیطانی'' میں فائٹر پائلٹ کی جاں بازی اور بیکسی کی داستان بیان کی گئی ہے۔ بارھویں باب سے سترھویں باب تک ہندوستانی فائٹر پائلٹس وکرم، سندھو، گیری، ہیری اور ملند کے لاہور جیل میں گزرتے شب و روز، جیل سے افغانستان کے راستے فرار ہونے کی کوشش، پھر پکڑے جانے اور اس پر عمل و ردِعمل کی روداد ابیان کی گئی ہے اٹھارہ سے بیسویں باب تک پاکستان کی سب سے محفوظ جیل لائل پور میں ہندوستانی فوجی کے ساتھ نیک و بد سلوک، پاکستانی فوجی افسران کے تلخ و شیریں عمل و ردِعمل کا بیان ہے اور آخر میں وزیر اعظم پاکستان ذوالفقار علی بھٹو کے ساتھ ایک تقریب اور پھر ہندوستانی قیدی فائٹر پائلٹس کی رہائی اور ہندوستان واپسی پر اس آپ بیتی کا اختتام ہوتا ہے۔

اس آپ بیتی میں پڑوسی ملک سے قربت اور دوریوں کا ذکر جس طرح کیا گیا ہے اور اس کے اردو ترجمے میں تخلیقی جوہر کا جو رس ہے وہ قاری کو اپنی گرفت میں لے لیتا ہے۔ اپنے ملک کی حفاظت اور انسانی رواداری کے باب میں یہ کتاب ہمارے جذبے اور احساس پر گہرے اثرات مرتسم کرتی ہے۔

● جدید عربی ڈراما

مترجم: ڈاکٹر شبیر احمد

صفحات: 232، قیمت: 250 روپے

ناشر: مکتبہ استعارہ، نئی دہلی-25

مبصر: ابوبکر عباد، ڈپارٹمنٹ آف اردو، یونیورسٹی آف دہلی، دہلی-7

ڈراما صرف ایک فن ہی نہیں انسانی سرشت کا حصہ ہے۔ دنیا کی سب قوموں اور تہذیبوں میں یہ فن موجود ہے۔ یہ انفرادی اور اجتماعی دکھ سکھ، عقیدے، احتجاج اور پیغام کو عام لوگوں تک پہنچانے کا عمدہ اور مؤثر ذریعہ ہے۔ یہ خیالی یا غیر حقیقی شے نہیں بلکہ اس کی جڑیں انسانی حالات اور سماجی واقعات میں پیوست ہیں۔ روم، یونان، ہندوستان، انگلستان اور فرانس عہد قدیم سے اس کے گہوارے رہے ہیں اور سوفوکلیز، شیکسپیر، کالی داس، مولیئر، بیکٹ، بریخت اور برناڈ شا وغیرہ اس کے امامانِ فن۔ قدیم یونان اور ہندوستان

میں فنونِ لطیفہ کی نازک ترین صنف یعنی شاعری کا عمل دخل ڈراموں میں زیادہ ہوتا تھا۔ گیت، رنگ، رس اور رقص کے امتزاج سے ان طویل ڈراموں کو اثر انگیز، دلچسپ اور مقبول عام بنایا جاتا تھا، کہ یہ اس عہد اور اس کے مذاق کا تقاضا ہوتا تھا اور اس وقت کے سست قدم اور سکون پرور ماحول کے عین مطابق بھی تھا۔ لیکن جب زندگی پیچیدہ تر ہوگئی اور فرصت کے اوقات بتدریج کم ہوتے گئے تو ڈرامے کی ہیئت اور تعریف میں بھی تبدیلیاں آئیں۔ ان میں سے ایک بڑی تبدیلی یہ ہوئی کہ ڈرامہ اب دیکھے اور دکھائے جانے کے علاوہ سننے اور پڑھنے پڑھانے کا فن بھی بن گیا۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ اب ڈرامے کثرت سے لکھے اور دوسری زبانوں سے ترجمے کیے جارہے ہیں، گوکہ اردو میں آج بھی دوسری اصناف کے مقابلے میں اس کی رفتار کم ہے۔

ڈاکٹر شبیر احمد کی زیرتبصرہ کتاب ''جدید عربی ڈرامہ'' اس لحاظ سے اہم ہے کہ اس کا تعلق دنیا کے بہترین شعراء کی آماجگاہ اور زبان کا خلاقانہ استعمال کرنے والوں کی سرزمین عرب سے ہے، جہاں ڈرامے کی کوئی مستحکم روایت تو نہیں رہی ہے لیکن اب وہاں اس طرف خاصی توجہ دی جارہی ہے۔ کتاب میں شامل بارہ ڈراموں میں سے چار توفیق الحکیم کے ہیں جو جدید عربی ڈرامہ نگاری کے بانی کہے جاتے ہیں۔ بقیہ آٹھ ڈرامے محمد یحیٰی، سمیر شخانی، مہدی ابوقرین، عمر ابونصر، علی احمد باکثیر، الاستاذ فتوح نشاطی، فہمی محمد رمزی اور صقر الرشید کے ہیں۔ ان میں سے تین ڈراموں کا تعلق ہندوستان سے ہے۔ پہلا ''رائی کا دانہ'' جس میں عظیم شخصیت مہاتما بدھ کی تعلیمات کی روشنی میں زندگی کے فلسفے کی صداقت اور زندگی کی بے ثباتی جیسی تلخ حقیقت کو مرکزی موضوع بنایا گیا ہے۔ دوسرا فہمی محمد رمزی کے ڈرامے 'الروح العظیم' کا ترجمہ 'مہاتما' ہے جو مہاتما گاندھی کے فکر و فلسفے اور ان کی زندگی کے اہم واقعات پر مبنی ہے، اور تیسرا سکندر اعظم اور ہندوستان کی ملکۂ حسن و جمال کے عشق و محبت پر استوار عمدہ ڈرامہ 'سعدیہ' ہے۔ ان کے علاوہ ایک خوبصورت تمثیل 'جنگ اور امن کے درمیان' ہے جس میں جنگ، امن اور ڈپلومیسی کو مجسم کرکے کرداروں کی حیثیت عطا کی گئی ہے۔ فلسطینی پس منظر میں لکھا گیا ڈرامہ 'پس پردہ جنگ' ہے جس میں مملکت اسرائیل کے وجود میں آنے کے اسباب پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ دو مزاحیہ ڈرامے 'نسیان' اور 'ایک شاعر چاند پر' کتاب کے موضوعی تنوع میں اضافہ کرتے ہیں۔

ان تمام ڈراموں کے ترجمے ڈاکٹر شبیر احمد نے بڑی خوبی سے کیے ہیں۔ ترجمے کے کام کو اردو میں بالعموم دوسرے درجے کی چیز سمجھا جاتا ہے جب کہ حقیقت یہ ہے کہ ترجمہ نگاری انتہائی مشکل اور بیحد اہم فن ہے۔ یہاں معاملہ صرف لفظوں کی جگہ الفاظ رکھنے اور معلومات منتقل کرنے کا نہیں بلکہ ان تمام چیزوں کے ساتھ کسی زبان میں بیان کیے گئے جذبات واحساسات اور تصورات کو اس زبان کی روح کو مجروح کیے بغیر دوسری زبان کے قاری تک اس طور پہنچانا ہوتا ہے کہ غیر زبان ہونے کے باوجود بھی اسے اجنبیت کا احساس نہ ہو۔

کتاب میں ڈراموں کے اصل عنوانات دے کر ڈرامہ نگاروں کا تعارف بھی کرایا جاتا تو زیادہ بہتر تھا۔

● غلام گردش (افسانے)

مصنف: عابد سہیل

صفحات: 208، قیمت: 160 روپے

ناشر: ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ، یوپی

مبصر: فیروز عالم، نظامت فاصلاتی تعلیم، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی،

''غلام گردش'' عابد سہیل کا نیا افسانوی مجموعہ ہے۔ عابد سہیل کا شمار ہمارے ان ادیبوں میں ہوتا ہے جنھوں نے کم لکھا لیکن جو کچھ لکھا، معیاری لکھا۔ عابد سہیل کا کمال ہے کہ وہ قاری کو اپنی تحریر کا ایک ایک لفظ پڑھنے پر مجبور کردیتے ہیں۔ ان کے افسانوں کے موضوعات ہماری روزمرہ زندگی کے عام مسائل ہیں۔ اقدار کی شکست وریخت، غریبی، لاچاری، فرقہ واریت، بدعنوانی، اخلاقی زوال، ریاکاری اور جانوروں سے بدتر انسانی زندگی کی حقیقی تصویریں ہمیں ان کے افسانوں میں نظر آتی ہیں۔ انھوں نے کمال فنکاری سے کرداروں اور سچویشن کے ذریعے اپنا نقطۂ نظر واضح کیا ہے۔ ان کی تمام تر ہمدردی مظلوم اور مجبور افراد کے ساتھ ہے لیکن اس کا اظہار وہ براہ راست نہیں کرتے۔ ان کے تمام افسانے قاری کو دعوت فکر دیتے ہیں۔ ان کے تقریباً ہر افسانے کا آخری پیراگراف یا آخری جملہ پورے افسانے کی کلید کی حیثیت رکھتا ہے۔ افسانہ جہاں ختم ہوتا ہے، وہاں سے قاری سوچنا شروع کرتا ہے۔ موجودہ سماجی نظام اور اس کے جبر نے کیوں عام آدمی کی زندگی کو اجیرن بنا رکھا ہے، یہی وہ سوال ہے جس پر عابد سہیل نے اپنے زیادہ تر افسانوں کی بنیاد رکھی ہے۔

''غلام گردش'' میں کل گیارہ افسانے شامل ہیں۔ ''ایک ادھوری کہانی'' اس مجموعے کا پہلا افسانہ ہے۔ اس میں کالج میں زیرتعلیم ایک غریب نوجوان کی کہانی بیان کی گئی ہے۔ وہ روزانہ نوکری کی تلاش میں گھر سے نکلتا ہے اور شام میں مایوس واپس آتا ہے۔ کالج میں حاضری کا رجسٹر مہینے میں دوبار کیشئیر آفس پہنچ جاتا ہے کیوں کہ وہ وقت پر فیس جمع کرنے سے قاصر ہے۔ اس کے دوست جو اس کے پان سگریٹ اور کبھی کبھی فلم کا خرچ اٹھاتے ہیں، اس کے فیس جمع نہ کرنے پر جب اس کا مذاق اڑاتے ہیں تو دوستوں کا یہ مذاق اس کی غیرت کو للکارتا ہے اب وہ ان کے ساتھ چائے خانے میں جاتا ہے تو کسی کے آگے بڑھنے سے پہلے پانچ روپے کا نوٹ نکال کر کاؤنٹر کلرک کو دے دیتا ہے۔ یہ وہ نوٹ تھا جسے'' وہ کئی دنوں سے مقدس ہیکل کی طرح سنبھالے ہوئے

تھا۔'' وہ جب گھر پہنچتا ہے تو ماں کو منتظر پاتا ہے لیکن ماں کا سامنا کرنے کی اس میں ہمت نہیں ہے۔

''اس نے ماں کی آنکھوں میں دیکھے بغیر کہا۔ ''ماں وہ روپے خرچ ہو گئے۔'' اب اس کا چہرہ آنسوؤں سے بھیگ گیا تھا۔

''اس کا چہرہ آنسوؤں سے بھیگ گیا تھا'' اس جملے پر افسانہ ختم ہو گیا۔ لیکن کیا واقعی ختم ہو گیا؟ آنسو بہہ رہے ہوں تو افسانہ ختم کیسے ہو سکتا ہے؟'' (ص 16)

افسانے کا یہ جملہ بے حد معنی خیز ہے۔'' آنسو بہہ رہے ہوں تو افسانہ ختم کیسے ہو سکتا ہے؟'' یعنی جب تک لوگوں کے دکھ درد ختم نہیں ہوں گے، افسانہ جاری رہے گا۔ یہ افسانہ دنیا کے ان کروڑوں لوگوں کے حال کا ترجمان ہے جن کا اکیسویں صدی کی چکاچوندھ بھری زندگی اور نئے زمانے کی نئی سوغاتوں میں کوئی حصہ نہیں ہے۔

''دستک کس دروازے پر'' فرقہ وارانہ فساد کے پس منظر میں لکھا گیا ہے۔ اس میں فساد کے دوران انسان کی نفسیات کی عکاسی کی گئی ہے۔ جس طرح رات میں قبرستان سے گزرتے ہوئے ڈر لگتا ہے اسی طرح فسادات کے دوران اپنے سائے سے بھی خوف معلوم ہوتا ہے۔ اس افسانے کے دو مرکزی کردار ہیں داؤد اور امیش۔ دونوں ایک دوسرے کے گہرے دوست ہیں جب فساد شروع ہوتا ہے تو داؤد اپنی بیوی اور بچوں کو سسرال چھوڑ آتا ہے۔ امیش دوسرے دن اس سے ملنے آتا ہے تو پوچھتا ہے کہ بھابھی کہاں ہیں۔ داؤد بہانہ بناتا ہے۔ لیکن امیش سمجھ جاتا ہے جاتے وقت وہ کہتا ہے۔

''میرے ہی گھر پہنچا دیتے۔'' (ص 20)

امیش کا یہ جملہ اس حقیقت کا اظہار ہے کہ تم نے مجھ پر بھی اعتماد نہیں کیا۔

رات میں جب شور و ہنگامہ ختم ہوتا ہے تو داؤد امیش سے ملنے کے لیے نکلتا ہے۔ لیکن وہ اس قدر خوفزدہ ہے کہ اندھیرے میں اسے امیش کے گھر کا دروازہ نہیں ملتا۔ بڑی دیر تک دروازہ تلاش کرنے کے بعد وہ شور سن کر وہاں سے تیزی سے بھاگ کر اپنے گھر آتا ہے۔ گھر کے پیچھے اسے روشنی نظر آتی ہے لیکن ادھر جانے پر کوئی نظر نہیں آتا۔ کئی ہفتے گزرنے کے بعد داؤد کی بیوی روبینہ ان دونوں کا مذاق اڑاتے ہوئے کہتی ہے۔

''یہ آپ لوگ ایک دوسرے کے مکان کے پیچھے کیوں چلے گئے تھے۔ کیا ایک دوسرے کا سامنا کرتے شرم آ رہی تھی؟'' (ص 26)

اس جملے پر افسانہ ختم ہو جاتا ہے۔ جس طرح پورے افسانے میں فرقہ وارانہ فساد کے ماحول میں عام انسانوں کی نفسیات کی حقیقی عکاسی کی گئی ہے اسی طرح اس آخری جملے میں فساد کے بعد کی نفسیات پیش کی گئی ہے کہ کس طرح دو فرقوں کے عام لوگ ایک دوسرے کا سامنا کرنے کی ہمت نہیں کر پاتے یا گھبراتے ہیں۔ حالانکہ فسادیوں سے ان کا کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ یہ شاید ان کے اندر کی انسانیت ہے جو انھیں کچوکے دیتی ہے اور دوسروں کے گناہ پر خود شرمندہ ہونے پر مجبور کرتی ہے۔

اس افسانے کا عنوان بھی غور طلب ہے۔ ''ایک سی صورتیں'' میں گھریلو نوکروں کی زندگی اور مالکوں کے ساتھ ان کے رشتے کو موضوع بنایا گیا ہے، نوکر لاکھ ایماندار ہو، کچھ اونچ نیچ ہو جائے تو شک کی سوئی اسی کی طرف گھومتی ہے۔ مالک ان سے بھلے ہی تمام جائز اور ناجائز کام کرائیں لیکن ان کی نظر میں ان کی کوئی حیثیت نہیں ہوتی۔ ان سب کے چہروں پر نوکر لکھا ہوتا ہے۔

اس افسانے کا آخری پیراگراف ملاحظہ کیجیے۔

''میں تو یہ سوچ رہا ہوں کہ معاملہ کیا ہے۔ سارے نوکروں کی صورتیں قریب قریب ایک سی کیوں ہوتی ہیں .... ایک دوسرے سے ملتی جلتی۔''

یہ تو نہیں معلوم کہ یہ بات سن کر ہر ایک کو اطمینان ہو گیا تھا یا نہیں لیکن اب ان کے چہروں پر نہ پہلے والی حیرت تھی، نہ الجھن، اور کئی تو یہ سوچنے لگے تھے کہ جب بھی وہ نوکر بدلتے ہیں تو اتنی جلدی سب کچھ پہلے جیسا کیوں ہو جاتا ہے۔'' (ص 52)

افسانہ ''صفیہ کو غصہ کیوں نہیں آتا'' میں ایک غریب عورت کو مرکزیت حاصل ہے۔ صفیہ گھروں میں کام کر کے اپنے شوہر اور بچوں کی کفالت کرتی ہے۔ حالات کے جبر نے اسے مصائب سہنے کا عادی بنا دیا ہے۔ اب اسے کسی بات پر غصہ نہیں آتا، جھنجھلاہٹ نہیں ہوتی۔ شوہر کو نوکری دلوانے کے لیے دو ہزار روپے کا انتظام کرتی ہے لیکن وہ تمام رقم دلال کی نذر ہو جاتی ہے جو روزانہ اس کے گھر آتا ہے، اور اس پر بری نظر رکھتا ہے۔ وہ بار بار اپنے شوہر کو کوئی کام کرنے کے لیے کہتی ہے لیکن اس نکھٹو کے کان پر جوں نہیں رینگتی۔ افسانے کی راوی جب اس کے حالات سن کر پوچھتی ہے کہ تو، اپنے شوہر سے اس بات پر لڑتی نہیں، تو وہ کہتی ہے۔

''آپا کتنا لڑوں۔ کتنا جھگڑا کروں۔ ایک دن کی بات ہو تو جی بھر کے لڑلوں، مار پیٹ بھی کر لوں۔ کب تک روز روز جھگڑا کر کے اپنی جان جلاتی رہوں۔ اس پر تو کچھ اثر ہی نہیں ہوتا...... اور آپا روز روز غصہ کرنے لگوں تو کام کیسے کر پاؤں۔ غصے میں جانگر بھی تو مارا جاتا ہے۔'' (ص 64)

یہ افسانہ پڑھ کر غالب کا یہ مشہور شعر یاد آ جاتا ہے۔

رنج کا خوگر ہوا انساں تو مٹ جاتا ہے رنج
مشکلیں مجھ پر پڑیں اتنی کہ آساں ہو گئیں

افسانہ ''غلام گردش'' میں امیر اور غریب کے درمیان کی خلیج کو موضوع بنایا گیا ہے۔ افسانے کا مرکزی کردار ایک ستر بہتر برس کا بوڑھا ہے جس کا تعلق ایک متمول خاندان سے ہے۔ وہ اپنے بھائی کی ملازمہ کی مدد کرنا چاہتا ہے۔ لیکن ڈرتا بھی ہے کہ اس کی بیوی کو معلوم ہوگا تو وہ خواہ مخواہ شک کرے گی۔ اس کو کھری کھوٹی سننی پڑے گی اور ملازمائیں بھلے ہی زبان سے کچھ نہ

کہیں، آپس میں اس کا مذاق اڑائیں گی۔ لیکن بدنامی کے خوف پر انسانیت کا جذبہ حاوی ہو جاتا ہے اور اپنے نوکر کے ہاتھ وہ اپنے بھائی کی بیمار ملازمہ کے پاس سو روپے بھجوا کر کسی اچھے ڈاکٹر کو دکھانے کی ہدایت دیتا ہے اور اس طرح سکون کی سانس لیتا ہے۔

''ایک کھردری سی رومانی کہانی'' میں ایک بے سہارا لڑکی روزی کی زندگی کو موضوع بنایا گیا ہے جس کی ماں بیمار ہے اور باپ شرابی۔ روز روز کے جھگڑے سے تنگ آکر اس کا بھائی گھر چھوڑ چکا ہے۔ حالات کا جبر اسے اپنے آپ کو بیچنے پر مجبور کرتا ہے۔ افسانے میں نظریے اور اصول کی باتیں کرنے والے اور غریبوں کی حمایت کا دم بھرنے والے بے عمل افراد پر زبردست طنز کیا گیا ہے۔ اس افسانے کا راوی جو ایک افسانہ نگار ہے، ایک مخصوص نظریے سے وابستگی رکھتا ہے اور غریبوں اور مظلوموں کا مددگار اور حمایتی سمجھا جاتا ہے۔ روزی کی پریشان حالی دیکھ کر اس کا دل تڑپ اٹھتا ہے۔ وہ دو سو روپے سے روزی کی مدد کرنا چاہتا ہے۔ اپنے گھر کے سامنے جھونپڑ پٹی میں رہنے والوں سے بھی اسے ہمدردی ہے اور وہ ان کی جھونپڑیاں اجاڑے جانے کا مخالف ہے۔ لیکن نہ وہ اپنے اخراجات میں سے اتنی رقم بچا پاتا ہے کہ روزی کی مدد کر سکے اور نہ کمہاریوں کی جھونپڑیاں اجڑنے سے روک پاتا ہے۔

''سگ گزیدہ مردم گزیدہ'' قدرے طویل افسانہ ہے۔ اس میں دو مرکزی کردار ہیں۔ ایک جونیئر کلرک اور اس کا کتا۔ افسانے کا آغاز کتے کی خود کلامی سے ہوتا ہے۔ اس کا مالک اس کا بہت خیال رکھتا ہے لیکن احسان جتاتا ہے۔ اس کے احسان جتانے کی وجہ سے کتے میں بیزاری بڑھنے لگتی ہے۔ غصے میں وہ دودھ پینا بھی چھوڑ دیتا ہے۔ مالک کی حرکتوں سے تنگ آکر وہ سوچتا ہے کہ کاش میں آدمی ہوتا اور پھر دھیرے دھیرے اس کی ہیئت میں تبدیلی آنے لگتی ہے اور وہ کتے کی جون سے آدمی کی جون میں آجاتا ہے۔ ایک صبح وہ یہ دیکھ کر حیران رہ جاتا ہے کہ وہ پوری طرح آدمی بن چکا ہے اور اس کا مالک کتا۔ یہاں سے کہانی ایک دلچسپ موڑ اختیار کرتی ہے اور اس کتے کو جواب آدمی بن چکا ہے، ان تمام مسائل سے سابقہ پڑتا ہے جن سے عام آدمی پریشان ہے۔ آفس میں باس کی ڈانٹ پھٹکار ساتھیوں کا برتاؤ، باس کے گھر جا کر مفت میں اس کے بچوں کو پڑھانا، گھر آکر مختلف مسائل سے واسطہ۔ تنگ آکر وہ سوچتا ہے کہ وہ کتے کی جون میں زیادہ سکھی تھا۔ افسانے میں انسانی سماج میں پائی جانے والی صورت حال کی حقیقی عکاسی کی گئی ہے اور زبردست طنزیہ اسلوب سے کام لیا گیا ہے۔

''شرطیں'' میں کرایہ دار اور مکان مالک کی نفسیات اور ان کے رشتے کے علاوہ بڑھتی ہوئی فرقہ واریت کو موضوع بنایا گیا ہے۔ اس کے دو مرکزی کردار ہیں محمد لطیف عرف للّے اور مکان مالکن جسے وہ چاچی کہتا ہے۔ چاچی جو ہندو ہے، کمرہ کرائے پر دینے سے پہلے کئی شرائط رکھتی ہے جن کو للّے مان لیتا ہے۔ چاچی کے گھر میں بجلی کے سامانوں کی مرمت کا کام شروع کرتا ہے اور اس کے لیے نیم پلیٹ لگانا چاہتا ہے تو چاچی نہ چاہتے ہوئے بھی انکار کر دیتی ہے کیوں کہ محلے والے یہ بات برداشت نہیں کریں گے کہ اس نے ایک مسلمان کو کرایہ دار رکھا ہے۔ چاچی دل سے چاہتی ہے کہ وہ اسی گھر میں رہے وہ اسے مشورہ دیتی ہے کہ نیم پلیٹ پر کوئی اور نام لکھوا لے لیکن للّے اپنا نام چھپانے کے لیے تیار نہیں ہوتا۔ وہ چاچی کی مجبوری سے واقف ہے اس لیے کمرہ چھوڑ کر جاتے وقت اس سے نہ ایڈوانس کے روپے واپس لیتا ہے اور نہ جمع رقم۔ جبکہ پچھلا کرایہ دار جو چاچی کا ہم مذہب تھا اس نے اسے بہت پریشان کیا تھا۔

افسانے میں بڑی خوبی سے یہ واضح کیا گیا ہے کہ اچھا انسان ہونے کے لیے کسی مخصوص مذہب کا ہونا ضروری نہیں ہے۔ نیز یہ کہ فرقہ واریت نے اپنی جڑیں اس قدر مضبوط کر لی ہیں کہ نہ چاہتے ہوئے بھی لوگ اس دلدل میں دھنستے جا رہے ہیں۔

افسانہ ''دوسری سانس'' کا مرکزی کردار نویں جماعت کا ایک لڑکا ہے وہ گھر سے اپنے ماموں کے یہاں جانے کے لیے نکلتا ہے۔ کرایے کے لیے اس کی جیب میں آٹھ آنے ہیں۔ راستے میں ایک چاقو بیچنے والا ملتا ہے جس سے وہ ایک خوبصورت چاقو خریدتا ہے۔ راستے میں وہ بار بار چاقو نکال کر دیکھتا ہے۔ ایک گورا اس سے چاقو دیکھنے کے لیے مانگتا ہے اور واپس کرنے کی بجائے اسے پریشان کرتا ہے۔ اس عمل میں گورے کا ایک ساتھی بھی شریک ہو جاتا ہے۔ لڑکا منت سماجت کرتا ہے، رو کر لوگوں سے چاقو دلوانے کی درخواست کرتا ہے لیکن نہ گوروں کو اس پر رحم آتا ہے نہ راہ گیروں کی ہمت ہوتی ہے کہ وہ اس معاملے میں کچھ بول سکیں۔ اچانک لڑکا پوری طاقت سے جھپٹا مار کر اپنا چاقو چھین لیتا ہے اور بھاگتے ہوئے ماموں کے گھر پہنچ جاتا ہے۔

''اور صرف ڈھائی مہینے بعد ہندوستان آزاد ہو گیا۔'' (ص 176)

افسانے کا آخری جملہ اسے علامتی حیثیت عطا کرتا ہے۔ یہ علامت ہے اپنے حق کے تئیں بیدار ہونے کی۔ ہندوستانی جب تک آمادۂ عمل نہیں ہوئے ان کی حالت نہیں بدلی لیکن جب وہ انگریزوں کی غلامی کا طوق اتار پھینکنے پر کمربستہ ہو گئے تو انگریزوں کو ہندوستان چھوڑنا پڑا۔ ''آندھیوں کی فصل'' اس مجموعے کا آخری افسانہ ہے جس میں بائیں بازو سے تعلق رکھنے والے نوجوانوں کے ذہن و فکر اور ان کے مسائل پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ یہ نوجوان ایک ایسے انقلاب کا خواب دیکھ رہے ہیں جب ساری گلیاں اور سڑکیں صاف ستھری ہو جائیں گی، کچے اور ٹوٹے پھوٹے مکان رہنے کے قابل بن جائیں گے، سب کو پیٹ بھر کھانا نصیب ہوگا، اونچ نیچ کا بھید بھاؤ نہیں ہوگا یعنی صحیح معنوں میں ساجواد (Socialism) آجائے گا۔ یہ نوجوان آپس میں جس طرح گفتگو کرتے ہیں اس سے لگتا ہے کہ اب انقلاب آیا ہی چاہتا ہے لیکن عملی

محاذ پر یہ نوجوان نکمے ثابت ہوتے ہیں اور اپنے ساتھی کا Restication ختم کرانے کے لیے کالج میں ایک ہڑتال تک نہیں کرا پاتے۔

اس افسانے میں ایسے کمیونسٹ رہنماؤں پر بھی طنز کیا گیا ہے جو دوسروں کو تو پارٹی کے اصول وضوابط پر عمل کرنے کا درس دیتے ہیں لیکن خود ان اصولوں پر عمل نہیں کرتے اور بھولے بھالے غریب نوجوانوں کو انقلاب کا سبز باغ دکھا کر اپنا مفاد حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

''غلام گردش'' کے تمام افسانے پڑھنے سے تعلق رکھتے ہیں۔ ہر افسانے کا موضوع ہمارے سماج کا کوئی نہ کوئی اہم مسئلہ ہے اور اس مسئلے پر عابد سہیل نے بڑی باریکی سے نظر ڈالی ہے۔ سب سے اہم بات یہ ہے کہ ان تمام افسانوں میں کہانی پن موجود ہے۔

● قرآن منظوم مع فرہنگ وتفسیر (جلد چہارم)

مترجم: پروفیسر محمد سمیع اللہ اسد

صفحات: 240، قیمت: 200 روپئے

ناشر: عرفان پبلیکیشنز، بی بی۔ 27/2، سالٹ لیک سٹی، کلکتہ۔ 700064

مبصر: فخرالدین وحید، 112، ماںڈوی ہوسٹل، جے این یو، نئی دہلی۔ 67

قرآن کریم پر ہر عہد میں مسلمانوں کی توجہ مرکوز رہی ہے۔ ترجمہ وتفسیر، الفاظ کی ادائیگی کے لیے ضابطوں کی تشکیل اور مسائل کے اخذ و استنباط کی مسلسل کوششیں ہوتی رہی ہیں۔ قرآن کریم کا منفرد لہجہ اور الفاظ کی حلاوت ہر کسی کو اپنا شیدائی بنالیتی ہے۔ اس بحر ناپیدا کنار کی تہوں میں علم وحکمت کے ایسے انمول موتی پنہاں ہیں جو گوہر شناس غواص کو آرام کرنے نہیں دیتے۔ شعور وآگہی کے ساتھ ایک ایک آیت میں تدبر، لازوال ذہنی بلندیاں عطا کرتا ہے اور عروج کی منزلوں پر پہنچنے کا یہ احساس کتنا مسرت آگیں ہوتا ہے۔

مترجم نے خداداد شعری ملکہ کو قرآن کے منظوم ترجمے کے لیے استعمال کیا۔ قرآن کریم کے ترجمے اور تفسیر کے لیے دسیوں علوم پر مکمل دسترس کی ضرورت ہے اور اس نازک عمل کو شعری قالب میں ڈھالنے کے لیے جس عرق ریزی، علمی گہرائی، اور شعری مہارت کی ضرورت ہے وہ بالکل عیاں ہے۔

مترجم نے قرآن کی آیتوں کو نظم کے ہار میں پرونے کا یہ کام نہایت حسن وخوبی کے ساتھ انجام دیا ہے زبان سادہ اور سلیس استعمال کی اور معانی و مفاہیم کو ابہام سے محفوظ رکھا ہے۔ نظم وشعر کے برگزیدہ حضرات تک علوم قرآن کو پہنچانے کی ایک کامیاب کوشش ہے زاد الآخرت نظم البیان، فصیح الکلام اور وجیہی منظوم، قرآن کے مکمل منظوم ترجمے ہیں۔ جزوی ترجمے بہت ہوئے ہیں۔ لیکن مترجم کے مطابق یہ سارے ترجمے تفسیری ہیں لفظی اور معنوی ترجمے نہیں۔ مترجم کا امتیازی وصف لفظی اور معنوی ترجمہ ہے۔

قرآن منظوم پانچ جلدوں میں ہے پہلی جلد میں سورۂ فاتحہ سے سورۂ نسا تک۔ دوسری جلد میں سورۂ مائدہ سے سورۂ توبہ تک۔ تیسری جلد میں سورۂ یونس سے سورۂ مریم تک اور چوتھی جلد میں سورۂ طٰہ سے سورۂ زمر تک۔ یہ چاروں جلدیں طبع ہوچکی ہیں اور مترجم کے الفاظ میں ''اگر خداوند کریم کی توفیق شامل حال رہی تو قرآن منظوم کی پانچویں اور آخری جلد ان شاء اللہ آئندہ سال تک مکمل ہوجائے گی۔

میرے زیر نظر ''قرآن منظوم'' کی جلد چہارم ہے۔ اس منظوم ترجمے میں خاص بات یہ ہے کہ ہر آیت کے ترجمے کے سامنے آیت نمبر درج ہے۔ ہر سورۂ، رکوع اور پارہ کی ابتدا کو اچھی طرح واضح کیا گیا ہے معنی کی تفہیم میں جہاں دشواری پیش آئی ہے اسے حاشیہ میں واضح کیا گیا ہے۔

چونکہ یہ قرآن کا منظوم ترجمہ ہے اس لیے مجھے جہاں پر کچھ نقص محسوس ہوتا ہے اس کو واضح کرنا چاہتا ہوں تاکہ اس پر نظر ثانی کرلی جائے۔ کچھ لفظ کتابت کی غلطی کا بار بار شکار ہوئے ہیں جیسے ''سورت'' جبکہ سورۃ لکھا جانا چاہیے ''نزدیک'' ذال کے ساتھ جبکہ ''ز'' سے ہونی چاہیے۔ ہندی اور انگلش کے الفاظ کا استعمال جو اردو میں خاص طور پر قرآن کے ترجمے میں زیب نہیں دیتا مثلاً ''ایک دوجے''، ''بلجیم''، ''بھگوان''، ''آشتی''، ''دھرتی''، ''آبرہم'' ابراہیم کے لیے اور ''ڈیوڈ'' داؤد کے لیے۔ کچھ مقامات پر بیان میں جھول نظر آتا ہے۔ جیسے ''گر پڑے گا عورتوں کے حمل بھی'' ص 40 اس شعر پر مصنف نے معذرت چاہی ہے مگر اس کو اس طرح بھی کہا جاسکتا تھا۔ ''گر پڑیں گے عورتوں کے حمل بھی''، ''نزد مولا ہے مرا اس کی جزا'' ص 99 ترتیب الفاظ نامناسب ہے۔ ''پائے گا اس کا وہ اک بہتر جزا'' ص 119 لفظ ''جزا'' مذکر نہیں مونث ہے۔ ''اس کا'' کی جگہ ''اس کی'' ''وہ نہیں سنتے ہیں تمھاری دعا'' ص 193 ''تمھاری'' غلط تلفظ کے ساتھ بندھا ہے ''رب اگر ماخوذ ٹھہراتا اگر'' ص 197 اگر کی تکرار ''اس کی ان میں ہے کوئی ذاتی غرض'' ص 220 غرض کو مذکر باندھ دیا ہے۔ ''سچے لوگوں میں اگر تو ہے سچا'' ص 104 مصرعہ ناموزوں ہے۔

بعض مقام پر معنی کی ادائیگی میں چوک ہوئی ہے مثلاً صفحہ 47 پر

ان سے پہلے لوگوں نے بھی نوح کی
قوم صالح اور قوم عاد بھی
لوط کی اور قوم ابراہیم کی
انبیاء کی سب ہی نے تکذیب کی

آیت کے صحیح معنی اس شعر میں ادا نہیں ہورہے ہیں۔ ''نیچی نظروں، موٹی آنکھوں والیاں'' ص 210 ''موٹی آنکھ'' حسن و جمال کی علامت کے لیے نہیں استعمال ہوتا ہے۔

مصنف اگلے ایڈیشن میں ایسے مقامات پر نظر ثانی کرلیں تو بہتر ہوگا۔

□□□

زبیر احمد بھاگلپوری

ہوشیار چور

پرانے زمانے میں ایک دولت مند آدمی تھا۔شہر میں زیورات کی اس کی ایک بہت بڑی دکان تھی۔

بدقسمتی سے ایک دن اس کی دکان میں چوری ہوگئی۔ جس وقت چور چوری کرنے میں مصروف تھے۔ اتفاق سے اس کی نیند ٹوٹ گئی اور وہ چوروں کو پکڑنے کے لیے زور زور سے چلانے لگا۔ اس کی آواز سن کر چور جلدی جلدی بہت سے زیورات لے کر فرار ہوگئے۔ جب آس پاس کے لوگ وہاں پہنچے تو دیکھا کہ دولت مند آدمی کے سر سے خون بہہ رہا تھا، چور فرار ہو چکے تھے۔لوگ فوراً اسے علاج کے لیے لے گئے۔

اس کے بیٹے نے چوری کی خبر بادشاہ کے دربار تک پہنچا دی۔ بادشاہ کو جب یہ معلوم ہوا کہ شہر کے سب سے امیر آدمی کی دکان میں چوری ہوگئی ہے اور اسے زخمی کر دیا گیا ہے، تو اسے بہت تکلیف ہوئی۔ اس نے چوروں کو تلاش کرنے اور انھیں گرفتار کرنے کے لیے سپاہیوں کو ہدایت دی۔ سپاہی مسافر کے بھیس میں جنگل کی جانب چل دیے، انھیں شبہ تھا کہ چور فرار ہو کر جنگل میں ہی چھپے ہوں گے۔

سپاہی جنگل میں تھوڑی دور ہی چلے تھے کہ ایک جگہ پر چار لوگ بیٹھے ملے۔ سپاہی ان کے قریب گئے۔ وہ اس وقت آپس میں ان زیورات کی تقسیم کر رہے تھے، جو انھوں نے قارون کی دکان سے چرائے تھے۔ چوروں نے مسافر کے بھیس میں سپاہیوں دیکھ کر پوچھا'' بھائی! تم لوگ کون ہو اور یہاں کس لیے آتے ہو؟''

ایک سپاہی بولا— '' ہم لوگ مسافر ہیں اور راستہ بھٹک گئے ہیں۔ بھلا آپ لوگ کون ہیں اور یہاں کیا کر رہے ہیں؟'' چور یہ سنتے ہی فرار ہونے کی کوشش کرنے لگے۔ سپاہی تو پہلے سے ہی مستعد تھے۔ انھوں نے چوروں کو گرفتار کرلیا۔ سپاہیوں نے انھیں ہتھکڑیاں پہنا کر کہا — '' تم سب چور ہو۔ ہم تمھیں گرفتار کرنے آتے ہیں۔ چلو، دربار میں۔ بادشاہ سلامت ہی تمھارا انصاف کریں گے۔''

چوروں نے خود کو چھڑا کر فرار ہونے کی بہت کوشش کی لیکن انھیں کامیابی نہیں ملی۔ جب سپاہی چوروں کو لے کر شہر سے گزر رہے تھے تو لوگ ان کی جانب انگلیاں اٹھا اٹھا چلا رہے تھے— '' چوروں کو دیکھو! چوروں کو دیکھو! سپاہی انھیں پکڑ کر لے جا رہے ہیں۔ انھوں نے ہی سوداگر کے یہاں چوری کی تھی۔''

سپاہی چوروں کو لے کر بادشاہ سلامت کے دربار میں پہنچے۔ داروغہ نے بادشاہ سلامت کو سلام کیا اور کہا— '' حضور! یہ چور جنگل میں زیورات تقسیم کر رہے تھے۔ یہ ہیں زیورات کی تھیلیاں، جو ان کے پاس سے ملی ہیں۔'' یہ کہتے ہوئے اس نے سارے زیورات بادشاہ سلامت کے سامنے رکھ دیے۔

بادشاہ سلامت نے غضبناک انداز میں چوروں کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔'' کیا تم لوگوں نے ہی قارون کی دکان سے چوری کی تھی؟''

چور منہ نیچے کیے، آہستہ سے بولے۔۔۔ ’’جی حضور‘‘

بادشاہ۔۔۔ ’’قارون کے سر پر ڈنڈا کس نے مارا تھا؟‘‘

ایک چور۔۔۔ ’’حضور! وہ راستے میں حائل ہو گیا تھا، اس لیے مجھے ڈنڈا چلانا پڑا۔‘‘

بادشاہ۔۔۔ ’’زیورات اٹھانے والے کون کون تھے؟‘‘

تینوں چور۔۔۔ ’’ہم تینوں نے ہی زیورات اٹھائے تھے۔‘‘

بادشاہ بہت زیادہ غضبناک تھا۔ اس نے بہت سخت سزا سنائی۔۔۔ ’’تم سب مجرم ہو، کیونکہ سبھی نے مل کر چوری کی ہے۔ اس لیے تم سب کو پھانسی کی سزا دی جاتی ہے۔‘‘

بادشاہ کے حکم کے بعد سپاہی چوروں کو تختۂ دار تک لے گئے۔ پھانسی دینے سے قبل باری باری سے ان چوروں سے پوچھا گیا۔ ’’تمھاری آخری خواہش کیا ہے؟‘‘ ان میں سے تین چوروں نے کہا۔’’اب تو مرنا ہی ہے، لہٰذا ہماری آخری خواہش کیا ہو سکتی ہے!‘‘ ان تینوں کو باری باری سے پھانسی پر چڑھا دیا گیا۔

جب چوتھے چور کی باری آئی تو اس کی بھی آخری خواہش خواہش پوچھی گئی۔ چوتھے چور نے کہا۔ ’’میری آخری خواہش بادشاہ سلامت سے ملنے کی ہے۔‘‘

جلاّد۔ ’’ان سے مل کر کیا کرو گے؟‘‘

چور۔ ’’انھیں ایک علم سکھانا چاہتا ہوں۔‘‘ مجھے خوف ہے کہ میری موت کے ساتھ ہی وہ علم کہیں ختم نہ ہو جائے۔‘‘

جلاّد۔ ’’وہ کون سا علم ہے؟‘‘

چور۔ ’’وہ تو بادشاہ سلامت کو ہی بتاؤں گا، تمھیں نہیں بتا سکتا۔ اگر تم بادشاہ کے پاس مجھے لے چلو گے تو وہ اس علم کا راز جان کر تمھیں انعام دیں گے۔ نہیں لے جاؤ گے اور انھیں پتہ چل گیا کہ میرے مرنے سے وہ علم ہمیشہ کے لیے ختم ہو گیا ہے، تو وہ تمھیں سزا دیں گے۔ لہٰذا مجھے بادشاہ کے پاس لے جانے میں ہی تمھاری بھلائی ہے۔‘‘

جلاّد چور کی بات سے متاثر ہو گیا اور اسے بادشاہ کے پاس لے گیا۔ وہ بولا۔ ’’حضور! اس چور کی آخری خواہش ایک خفیہ علم آپ کو بتانے کی ہے۔ یہ کہتا ہے کہ پھانسی پر چڑھنے سے قبل میں وہ علم بادشاہ سلامت کو بتا دینا چاہتا ہوں، تاکہ اس علم کا خاتمہ نہ ہونے پائے۔‘‘ یہ بات سن کر بادشاہ نے سنجیدگی سے پوچھا۔ ’’ارے رذیل چور! تو کون سا علم مجھے بتانا چاہتا ہے؟‘‘

چور۔ ’’حضور! گستاخی معاف ہو۔ میں سونے کی فصل بونے کا علم جانتا ہوں۔‘‘

بادشاہ۔ ’’سونے کی فصل؟ سونے کی فصل کو کہاں اور کیسے بوئے گا؟‘‘

چور۔ ’’حضور! سونا تو کہیں سنسان جگہ میں ہی بویا جائے گا۔ پہلے زمین تیار کرنی ہوگی۔ سونے کے بیج بنانے کے لیے اس کے سرسوں

جیسے چھوٹے چھوٹے دانے بنانے ہوں گے۔ زمین تو میں تیار کروں گا لیکن بیج کسی سونار سے بنوا کر میرے پاس لانے ہوں گے۔''

بادشاہ نے محل کے قریب ہی ایک زمین چور کو دکھائی۔ چور نے کہا۔'' یہی زمین مناسب ہوگی کیونکہ یہاں تک کم ہی لوگوں کی رسائی ہوگی۔'' اس نے زمین تیار کی۔ ادھر سونے کے بیج بھی تیار ہو کر آگئے۔ چور نے کہا۔'' حضور! اب سب چیزیں مہیا ہو چکی ہیں۔ اب صرف سونا بونے والا کوئی آدمی چاہیے۔''

بادشاہ۔'' ارے چور! تم ہی بودو۔''

چور۔'' نہیں حضور! چور کے ذریعے بویا ہوا بیج نہیں اگتا۔ جس نے کبھی چوری نہ کی ہو، سونا وہی بو سکتا ہے۔ براہ کرم حضور ہی یہ مبارک کام کر دیں۔''

بادشاہ (کچھ سوچ کر)۔'' نہیں، بچپن میں میں نے داوی کے لڈو چرا کر کھائے تھے۔ اس لیے مجھے بھی سونا بونے کا حق نہیں۔''

چور۔'' حضور! آپ کے قاضی صاحب تو بڑے ہی دیانتدار ہیں۔ وہی یہ کار خیر کر ڈالیں۔''

قاضی۔'' نہیں بھائی، ایک بار میں نے بھی والد صاحب کی جیب سے روپے نکالے تھے۔''

چور۔'' حضور! کوئی وزیر، سپاہی یا داروغہ ہی سونے کی فصل لگانے کا اہم کام انجام دے۔''

وزیر۔'' بادشاہ سلامت! میں اور میرے ساتھی سرکاری خادم ہیں ہمیں قدم قدم پر چوری کرنا پڑتی ہے۔ لہٰذا سونا ہم سے بھی نہیں بویا جائے گا۔''

چور۔'' حضور! جب یہاں موجود سبھی لوگ چور ہیں، تو صرف مجھے ہی پھانسی کیوں دی جا رہی ہے؟ بادشاہ سلامت! آپ کا اقبال بلند ہو، بڑے لوگوں کا چھوٹے لوگوں کو معاف کرنا شیوہ ہوتا ہے۔ کیا آپ اتنے بڑے بادشاہ ہو کر میرا جرم معاف نہیں کریں گے؟''

بادشاہ چور کی بات سن کر انگشت بدنداں رہ گیا اور بولا۔'' چور! تم عقل مند ہو۔ میں تمھارا جرم معاف کرتا ہوں۔ میں چاہتا ہوں تم میرے ساتھ ہی رہو اور وقت وقت پر مجھے مشورہ دیا کرو۔

اس طرح اپنی حاضر دماغی کا استعمال کر کے ہوشیار چور پھانسی پر لٹکنے سے بچ گیا۔ لہٰذا ہر آدمی کو زندگی میں کسی بھی مصیبت کے وقت گھبرانا نہیں چاہیے بلکہ اپنے دماغ کا استعمال کرتے ہوئے راہ نجات تلاش کرنا چاہیے۔

□□□

پتہ:
Urdu Section
Bihar Legislative Council,
Patna-15

جلیل عشرت

مجھے معاف کر دو

صارم خوبصورت اور پر کشش چہرے کا مالک تھا۔ وہ ذہین اور پڑھنے لکھنے میں بہت تیز تھا۔

آج وہ رکشا پر بیٹھا اپنے دوست ہمایوں کا شدت سے انتظار کر رہا تھا۔ رکشے والے نے کہا ''لگتا ہے ہمایوں اسکول نہیں جائے گا۔ انتظار اب بیکار ہے۔ اسکول کا وقت بھی ہو گیا۔ کہیے تو رکشا آگے بڑھاؤں؟''

''ٹھہر جاؤ—وہ دیکھو—ہمایوں بھاگتا ہوا ادھر آرہا ہے۔ یہ کیا۔! وہ اسکول یونیفارم میں نہیں ہے۔'' صارم نے حیرت کا اظہار کیا۔

''صارم معاف کرنا۔ آج میں اسکول نہیں جاؤں گا۔ یہ درخواست سر کو دے دینا'' ہمایوں نے ہانپتے ہوئے کہا۔

''آخر کیوں؟ کہو تو میں بھی رک جاؤں۔'' صارم کے جملے میں اپنا پن تھا۔ ''میں اپنے کلب کی جانب سے کرکٹ کھیلنے جا رہا ہوں۔ کل تمھیں بتانا بھول گیا تھا۔ تم اسکول چلے جاؤ۔ بس میرے لیے دعا کرنا کہ ''مین آف دی میچ'' ہو جاؤں۔''

رکشا اسکول کی طرف چل پڑی۔ صارم تنہا رکشا پر سوار تھا۔ تنہائی میں ایک پرانی سوچ اس کے دماغ پر چھا گئی۔ ''کاش میں بھی دوسرے لڑکوں کی طرح فٹ بال، کبڈی، ہاکی اور کرکٹ کھیل پاتا۔ اسکول کے اسپورٹس میں شامل ہو سکتا۔ زندگی کی امنگ اور ترنگ میں برابر کا حصہ دار ہوتا اوروں کی طرح میرے دل کے چمن میں بھی رنگ برنگے پھول کھلتے۔''

سوچتے سوچتے اس کی آنکھوں سے آنسو کے چند قطرے ٹپک پڑے تبھی صارم اچانک خیالوں کی دنیا سے باہر چلا آیا۔ رکشا اسکول کے سامنے رک چکی تھی وہ نیچے اترا۔ بستر سنبھالا اور اپنے کلاس روم کی طرف چل پڑا۔

گھنٹی کے بعد تمام بچے صف آرا ہو گئے۔ فضا میں اسکول کا ترانہ گونج اٹھا۔

لب پہ آتی ہے دعا بن کے تمنا میری
زندگی شمع کی صورت ہو خدایا میری

کلاس میں بیٹھتے ہی اجمل نے صارم پر فقرہ کس دیا۔

''کیوں بے لنگڑے! آج اکیلے ہی؟ کیا ہمایوں نے بھی ساتھ چھوڑ دیا؟''

صارم نے اجمل کی طنزیہ باتیں سن لیں لیکن وہ خاموشی سے اپنی جگہ پر بیٹھ گیا اور ڈیسک پر سر جھکا کر سسکنے لگا۔ کلاس میں ٹیچر داخل ہوئے تو سب بچے ایک ساتھ کھڑے ہو گئے۔ لیکن صارم اپنی جگہ بیٹھا ہچکیاں لیتا رہا۔

''سب بیٹھ جائیں۔'' پھر صارم کی طرف رخ کر کے ماسٹر صاحب نے پوچھا'' صارم تم کیوں رو رہے ہو؟''

صارم کی ہچکیاں اور تیز ہو گئیں۔

''مانیٹر— تم بتاؤ معاملہ کیا ہے؟''

مانیٹر نے کھڑے ہو کر ساری باتیں بتا دیں۔

ماسٹر صاحب نے اپنے غصے پر قابو پاتے ہوئے اجمل کو مخاطب کیا۔'' اجمل تم اپنی شرارت سے باز نہیں آ ؤ گے؟ صارم تمھارا ساتھی ہے، کسی کے جذبات کو ٹھیس پہنچانے کا حق تمھیں کس نے دے دیا؟ یہ انتہائی غلط بات ہے آئندہ ایسی حرکت نہ ہو۔ سچ تو یہ ہے کہ صارم ہم سب کی ہمدردی اور پیار کا مستحق ہے۔''

صارم پیدائشی معذور نہیں تھا۔ بلکہ ایک حادثے نے اس کی ٹانگ خراب کر دی تھی۔ اس کے والد حسین صاحب اسی اسکول کے ہیڈ ماسٹر تھے۔ ایک دن وہ اپنے خاندان کے ساتھ آٹو رکشا سے اپنی بیٹی اور داماد کے گھر جا رہے تھے۔ راستے میں ایک گاڑی نے ٹکر ماردی۔ یہ ایک بڑا حادثہ تھا۔ اس حادثے میں صارم بچ گیا لیکن اس کے ابو اور امّی جائے حادثہ پر ہی اللہ کو پیارے ہو گئے۔

صارم کی ہمشیرہ نے اپنے چھوٹے بھائی کو بچانے کے لیے بے دریغ خرچ کیا۔ مہنگے علاج سے اس کی جان تو بچ گئی۔ لیکن بائیں پاؤں میں نقص پیدا ہو گیا۔

ماسٹر صاحب کلاس سے مخاطب تھے: عزیز بچو! اس طرح کا حادثہ کسی کے ساتھ بھی ہو سکتا ہے اور اسے معذور اور اپاہج بنا سکتا ہے۔ حکومت نے ایسے لوگوں کو بہتر زندگی گذارنے کے لیے مختلف شعبوں میں خاص سہولت دے رکھی ہے۔ تاکہ وہ بھی دوسروں کے ساتھ قدم سے قدم ملا کر چل سکیں ہمیں کسی کو کمتر سمجھنے کا کوئی حق نہیں۔ کیونکہ سب کو اپنی زندگی اپنے ڈھنگ سے جینے کا حق ہے۔ سب کے سامنے ایک منزل ہوتی ہے اور بلند حوصلہ رکھنے والے وہاں پہنچ کر ہی دم لیتے ہیں۔''

کلاس میں سناٹا چھا گیا تھا۔ اجمل کا سر ندامت سے جھکا ہوا تھا۔ وہ آہستہ سے کھڑا ہوا اور نرم لہجے میں صرف اتنا کہہ سکا کہ'' صارم۔ مجھے معاف کر دو۔ پلیز مجھے معاف کر دو۔''

□□□

پتہ:

R.B. Manzil,

Jahangiri Mohalla,

Asansol-713302(W.B.)

سیمینار کے شرکا

جناب محمود الرحمٰن

مولانا محمد ولی رحمانی

پروفیسر ایم. پی. سنگھ

پروفیسر لطف الرحمٰن

پروفیسر سلیمان خورشید

پروفیسر شاکر خلیق

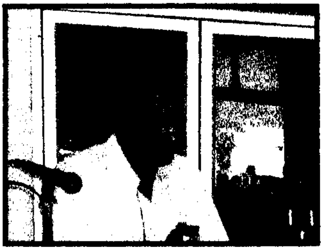

پروفیسر شبیر حسن

جناب شمر امام

Date of Publication : 24/05/2008
Date of Dispatch : 25 & 26 of advance month

URDU DUNIYA Monthly, June 2008, Vol. 10, Issue: 6
National Council for Promotion of Urdu Language
Department of Higher Education, Ministry of H.R.D., Government of India

ڈاکٹر پرویز نظیر

ڈاکٹر شیریں زبان خانم

ڈاکٹر رضوان قیصر

جناب عاصم شہنواز شبلی

ڈاکٹر فاضل ہاشمی

جناب انیس چشتی

ڈاکٹر آفتاب آفاقی

ڈاکٹر ابوبکر عباد

ڈاکٹر ارجمند آرا

ڈاکٹر مشتاق احمد

جناب جاوید رحمانی

جناب عطاء الرحمٰن قاسمی

Printed and Published by Dr. Ali Javed, Director, NCPUL on behalf of NCPUL and
printed at S. Narayan & Sons, B-88, Okhla Indl. Area, Phase-II, New Delhi-110020 and published at
NCPUL, West Block-1, Wing-6, R.K. Puram, New Delhi-110066, Editor : Dr. Ali Javed, Tel : 26103381, 26103938